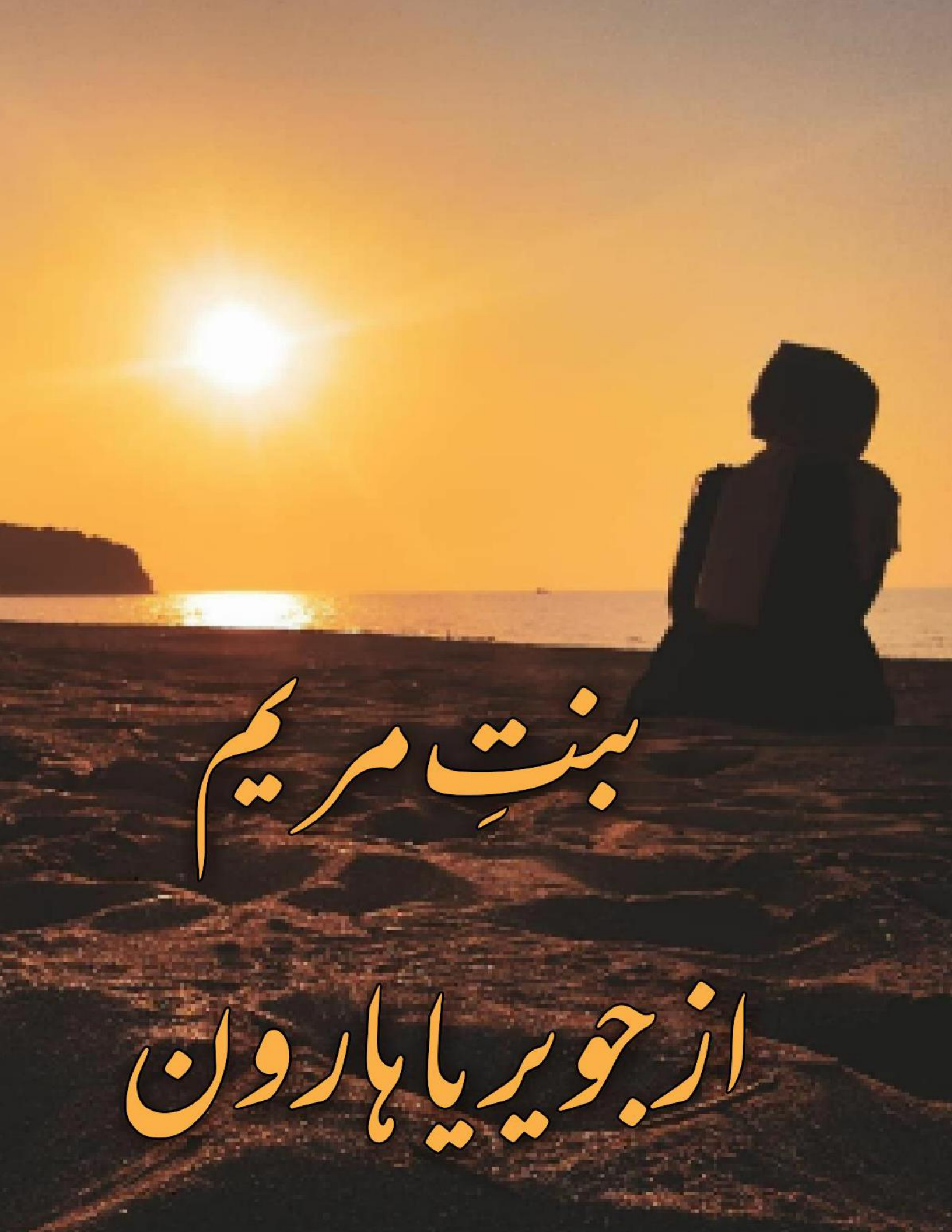
بنتِ مریم
از جویریا ہارون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بنتِ مریم

قسط نمبر 6:

کافی دنوں سے ارشاد اظہری کی کالز آرہی تھیں۔ لیکن وہ مسلسل انہیں نظر انداز کر رہا تھا۔ ضرور وہ گھر کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتے ہونگے۔ لیکن وہ وکال سے کمٹمنٹ کر چکا تھا۔ اور انہوں نے اسے تسلی دی تھی کہ کچھ دنوں میں وہ اس کا گھر خرید لینگے۔ اور پھر جب تک وہ لوگ انڈونیشیا سے واپس نہیں چلے جاتے، وہ یہاں بہت آرام سے رہ سکیں گے۔ اس کی آدھی سے زیادہ ٹینشن ختم ہو گئی تھی۔ گھر بیچتے ساتھ ہی اسے یہاں سے واپس جانے پر فوکس کرنا تھا۔ کورونا تھا کہ دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور ہر جگہ لاک ڈاؤن سخت ہو چکا تھا۔ لیکن اسے کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہی تھا یہاں سے واپسی کا۔

آفس کا کچھ کام کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سوچوں میں گم تھا کہ فون پھر سے بجنے لگا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا تو وہاں یودا کی کال آرہی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے تمہیں اور تمہارے والد محترم کو ہاں؟ کب سے مجھے کال کر کے تنگ کیے جا رہے ہو۔ تم اگر یہ سوچ رہے ہو کہ تم میرے گھر پر واقعی کوئی قبضہ کر سکتے ہو تو تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ میں تم لوگوں کی کوئی چال کامیاب ہونے نہیں دونگا۔" فون اٹھاتے ساتھ ہی وہ شروع ہو گیا۔

"آحل۔ آحل۔ پہلے بابا کی بات تو سن لو۔ وہ تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں تم دونوں کی کوئی بھی بات نہیں سنوں گا۔ میں اسفندیار خان کی طرح کمزور نہیں..." اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی جب

دوسری طرف سے ارشاد اظہری کی آواز آئی۔

"آحل پترا۔ کیا ہم مل سکتے ہیں کہیں؟ مجھے لگتا ہے ہمیں آپس میں ہی اس گھر کے مسئلے کو حل کر لینا چاہیئے۔" وہ بہت میٹھے لہجے میں بول رہے تھے۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولا۔

"کہاں ملنا ہے؟ جلدی بتاؤ، میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ تم بات بیٹے پر صرف کرتا پھروں۔" اگلی طرف انہوں نے جیسے ہی جگہ بتائی اس نے فون بند کر دیا۔ وہ آگے سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن اس نے سننا ضروری نہیں سمجھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک ریسٹوران میں داخل ہوا۔ وہاں بہت سخت سیکیورٹی نافذ کی گئی تھی۔ ماسک کے بغیر اندر جانا ممنوع تھا اور داخلی دروازے پر کچھ دیر کے لیے ہر آنے والے کو روکا جا رہا تھا اور اس پر سینیٹائزر چھڑکا جا رہا تھا۔ اندر بہت کم لوگ موجود تھے۔ اور وہ بھی بہت فاصلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب ویٹرز اور سٹاف والے بھی بہت احتیاط کر رہے تھے۔

دوسری منزل پر آ کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک تو ماسک میں لوگوں کو پہچاننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ یودا نے ہاتھ اٹھا کر اسے اشارہ کیا تو وہ اپنے احساسات ضبط کرتا وہاں آیا۔ دونوں باپ بیٹا ٹیبل کے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دوسری طرف کرسی کھینچ کر بیٹھا اور ٹانگ پر ٹانگ جمالی۔

"چلو اب شروع ہو جاؤ ارشاد اظہری۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

"کیسے ہو آحل۔ تمہاری ماں کیسی..." اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

"اوہوں۔ کوئی بھی تمہید باندھے بغیر سیدھا مدعے پر آؤ۔ تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔" اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں پہنی گھڑی کو دیکھا۔ اس نے آگے سے مسکرا کر سر ہلایا۔

"میں تمہارے گھر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو پترا... وہ اب تمہارے کسی بھی کام کا نہیں ہے۔ تم تو ویسے بھی اپنے ملک چلے جاؤ گے۔ نہ تم اسے کرائے پر دیتے ہو۔ وہ گھر ہمیں دے دو۔" وہ آنکھوں میں غصہ لیے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ انہوں نے

اسے روکا۔ "نہیں آحل۔ میں اسے مفت میں لینے کی بات نہیں کر رہا۔ جانتا ہوں تمہیں ضرورت ہو گی پیسوں کی۔ میں تمہارا حق مار کر اس گھر کو بلکل نہیں اپناؤں گا۔ آخرت میں اللہ کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔" یودا کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائے۔ اس نے آنکھیں چھوٹی کر کے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔

"بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں آحل۔ ہم تمہیں اس گھر کے لیے اچھی رقم دیں گے۔ مارکیٹ پرائس سے تھوڑی کم ہو گی لیکن دیکھو آحل۔ تمہارا تو اس میں بھی فائدہ ہی ہو گا نا۔ کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہو گا۔" کچھ دیر اس نے آحل کے تاثرات دیکھے۔ وہ سپاٹ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہمارے پاس فلحال اتنے پیسے ہیں بھی نہیں لیکن بیٹا میں اپنے دوست سے ادھار لے کر تمہیں دونگا۔ تمہارا حق..."

"میں نے کہا میرے سامنے تمہیدیں نہیں۔ کتنے دے سکتے ہو تم مجھے میرے گھر کے لیے؟"

"پچاس۔"

"تمہارا مطلب پچاس لاکھ؟" اس نے ایک ابرو اٹھا کر یودا کو دیکھا تو اس نے آگے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سر جھٹک کر ہنسنے لگا۔

"اچھا۔ تو تمہارا خیال ہے، کہ تین ساڑھے تین کروڑ کی مالیت والا گھر میں تمہیں پچاس لاکھ میں دے دونگا۔ تم دونوں باپ بیٹے کا دماغ چل گیا

ہے۔ اور کچھ نہیں۔ یا شاید تم لوگ مجھے بچہ سمجھ بیٹھے ہو۔"

"دیکھو آحل ہم..."

"ملاقات کا وقت ختم ہوا۔" ایک جھٹکے سے کرسی دھکیل کر وہ اٹھا۔ "آئندہ ایسی چالبازیاں کسی پاگل کے ساتھ کھیلنا۔ میں نہ ہی دودھ پیتا بچہ ہوں نہ پاگل۔" انہیں کہہ کر وہ مڑا اور جانے لگا۔

"سنا ہے تمہاری بیوی بھی آئی ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔" پیچھے سے یودا کی آواز آئی تو اس کے قدم وہیں زنجیر ہوئے۔ آنکھوں میں

خون اترا۔ مڑ کر اس نے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"میں تمہیں صرف ایک صلاح دے رہا ہوں۔ آگے تمہاری مرضی۔" اس نے معصومیت سے کندھے اچکائے۔ ساتھ بیٹھا اس کا باپ بھی مسکرایا۔ آحل کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے بڑے ضبط سے اپنی مٹھی بند کی اور کھڑے کھڑے اس کی طرف جھکا۔

"تمہیں لگتا ہے میں تم سے ڈر گیا ہوں؟ اوکم آن۔ مرد بنو یودا اظہری۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ اسے چیلینج کر رہا تھا۔ "ایک مرد سے مرد بن کر مقابلہ کرو۔ عورتوں کو بیچ میں لا کر تو تم ایک بزدل انسان بنو گے۔ مرد بن کر محنت کرو، پیسہ کماؤ اور پھر مجھ سے آ کر گھر کی بات کرنا۔ ہوں؟"

"ہماری آفر کو رد کر کے تم پچھتاؤ گے۔"

"پچھتائے گا تمہارا یہ دو ٹکے کا باپ اور تم۔ میں تم لوگوں کی مزید بکواس نہیں سننا چاہتا۔ بس پہلی اور آخری دفعہ تمہیں وارن کر رہا ہوں۔" شہادت کی انگلی اٹھا کر وہ بولا۔ "میری بیوی کو اگر تم نے اپنی غلیظ نظروں سے ایک دفعہ بھی دیکھا۔ خدا کی قسم میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دونگا۔ اور اسے صرف دھمکی مت سمجھنا۔ میں اس سے زیادہ بھی کر سکتا ہوں تمہارے ساتھ۔" کرسی کو ٹھوکر مار کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا۔ البتہ کانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس یودا کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

وہ آج پھر سے اس کے کمرے میں اس کی ڈائری کھول کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کیا پتا اور بھی بہت کچھ اس ڈائری میں ہو جو اسے پتا نہ ہو۔ اس باکس کو کھولتے ہوئے، اس کا پاسورڈ ڈالتے ہوئے اسے نورفیاہ کی بات یاد آئی تھی۔ اوہ!! تو وہ اس لیے ان دونوں کے لیے 'ہیٹ' کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ ظاہر ہے طلاق ہوئی تھی تو نفرت ہی کرتے ہونگے ایک دوسرے سے۔ خیر، کسی اور وجہ سے بھی ہو سکتی تھی۔ فلحال کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔

مگر اس دن وہ رنوفیاہ پر بلاوجہ ہی غصہ ہو گئی تھی۔ وہ تو وہی کہہ رہی تھی جو سچائی تھی۔ اور وہ اتنی اچھی ہے کہ آگے سے برا بھی نہیں

منایا۔

ڈائری نکال کر اس نے وہیں سے پڑھنا شروع کیا جہاں سے اس دن چھوڑا تھا۔

"میرے دوست، احمد نے بتایا تھا کہ امے اور بابا کی طلاق رینا کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے بابا نے امے کو ڈانٹا اور گھر سے نکال دیا۔ اس نے میری فیملی کو توڑ دیا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کرونگا۔ کبھی نہیں۔

لیکن میں ابھی اس وجہ سے اداس نہیں ہوں۔ میں تو اپنے دوستوں کی وجہ سے اداس ہوں۔ آج مجھے اسکول میں بہت رونا آیا۔ لیکن میں نہیں رویا، میں نے سوچا اب تو تم ہو نا میرے پاس۔ میں تم سے شئیر کروں گا۔" پڑھتے پڑھتے وہ جیسے آحل اسفندیار کے بچپن میں پہنچ گئی تھی۔

صبح کا وقت ہو رہا تھا۔ بادل ہر سو چھائے ہوئے تھے۔ وہ ایک اسکول کا بڑا سا گراؤنڈ تھا۔ جہاں چند جھولے لگے ہوئے تھے۔ سامنے بنی اسکول کی بلند عمارت پر بڑا سا سرخ اور سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور ایک طرف، بلڈنگ سے بچوں کی لمبی قطار وہیں آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے سفید اور لال یونی فارم پہنے ہوئے تھے۔ لڑکیوں نے چھوٹے چھوٹے سکارف پہن رکھے تھے۔ وہ سب کھلکھاتے ہوئے دوڑ کر آرہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ان کی ٹیچر بار بار ان کی قطار درست کروا رہی تھیں۔ آج موسم اچھا تھا جس کے باعث انہیں گیم پریڈ ملا ہوا تھا۔

کچھ بچے جا کر جھولوں پر بیٹھ گئے۔ باقی ٹیمز بنا کر کھیلنے لگے۔

"میں بھی کھیلوں تم لوگوں کے ساتھ؟" وہ پھولے سے گالوں والا سرخ اور سفید سا بچا، بچوں کے اس گول دائرے میں آیا۔ اور

ہاتھ آگے کر کے مسکرا کر بولا۔ اس کی بات پر باقی بچوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"بلکل بھی نہیں۔ تم ہمارے ساتھ نہیں کھیلو گے۔ تمہیں پرسوں بھی میں نے سمجھایا تھا۔ جاؤ اب یہاں سے۔" ایک تیز سی بچی اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے تیور چڑھا کر بولی۔

"عمار، تم اسے سمجھاؤ نا۔ میں کسی کو کچھ نہیں بولوں گا۔ بس صرف کھیلوں گا۔ پلیز؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"نہیں آحل۔ جاؤ یہاں سے۔ تم گندے ہو، ہم میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں کھیلے گا۔" اسے دھکا دیتے ہوئے وہ بولا۔

پھر سب اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے وہاں سے چلے گئے۔ اس نے اپنے یونی فارم پر نظر دوڑائی، وہ جگہ جگہ سے میلا ہو رہا تھا۔ اس کے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔

"میں نے دھویا تو تھا کل، اب صاف نہیں ہوا تو کیا کروں؟" کندھے جھٹک کر وہ بڑبڑایا۔ اور زبردستی مسکراتا ہوا جھولوں کے پاس آ گیا۔

"کیا تمہارے بعد میں جھولے پر بیٹھ جاؤں؟" مسکرا کر وہ جھولے پر بیٹھے احمد سے بولا تو فوراً دوسرا بچہ اس کے سر پر آ پہنچا۔

"بلکل نہیں۔ احمد کے بعد میں کھیلوں گا۔"

"میں تھوڑی دیر اس پر بیٹھ کر تمہیں واپس کر دونگا۔" وہ منت کرنے لگا۔

"نہیں۔ ہم تمہیں یہاں کھیلنے نہیں دینگے۔ تم گندے ہو۔ اور تمہاری تو ماما بھی نہیں ہیں۔" وہ ایک دم سے چپ ہو کر پیچھے ہو گیا۔ آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو آئے۔ باقی سب اس بچے کی بات پر ہنس رہے تھے۔

"پتا ہے، میری امے بتا رہی تھیں کہ طلاق بہت بری بات ہوتی ہے۔ تمہارے پیرنٹس بہت برے ہیں نا۔" ایک لڑکی آحل کی طرف مڑ کر کہہ رہی تھی۔ وہ ایک تیز نظر ان سب پر ڈال کر وہاں سے مڑ گیا۔ اپنے بازو سے آنکھیں پونچھتا وہ اس گراؤنڈ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ ٹانگوں کے گرد کیے وہ اداس سا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

"اللہ۔ میرا کیا قصور ہے اگر بابا اور امے کی طلاق ہو گئی ہے۔ بتائیں نا اللہ تعالیٰ؟... یہ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ نے احمد کو دیکھا؟ اس نے بھی مجھے دیکھ کر منہ موڑ لیا تھا۔ میرا تو کوئی دوست نہیں ہے یہاں۔ اب میں اپنی باتیں کس سے شئیر کروں گا؟" اس نے ایک گیلی سانس اندر کھینچی۔

دور کہیں اسے بابا کی آواز سنائی دی تھی۔ جب آپ کا کوئی دوست نہ ہو تو قلم اور کتاب آپ کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں۔

پھر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اسے یاد آیا۔ پچھلے ہفتے اس نے ایک دکان سے اپنے لیے ڈائری خریدی تھی۔ وہ جانتا تھا اب گھر جا کر اسی میں سب کچھ لکھنا تھا۔ اسے ہی اپنی دوست بنانا تھا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

اگلے دن اس کی اسکول سے چھٹی تھی۔ اسفندیار خان بھی گھر پر ہی تھا۔ پژمردہ سی حالت، بکھرے کپڑے، الجھے بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے اور بے رونق چہرہ لیے وہ کچن میں کھڑا، سنک میں برتن دھو رہا تھا۔ سامنے کرسی پر بیٹھا آحل اسے دیکھتا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بابا۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔" وہ آہستہ سی آواز میں بولا تو اسفندیار نے مڑ کر دیکھا۔

"کیا؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ اسکول کے بعد میں کہیں پر کام کر لیا کروں گا۔ پھر ہم ایک میڈ رکھ لیں گے۔" وہ بہت پر جوش سا بول رہا تھا۔ اور اسفندیار خان ششدر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کتنا سا تھا، اور باتیں کیسی کر رہا تھا۔ ٹوٹی بند کر کے انہوں نے ایپرن اتارا اور ٹاول سے ہاتھ پونچھ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھا۔

"آحل۔ کس نے کہا ہے تم سے یہ سب ہاں؟ بتاؤ مجھے۔ حد ہے، اپنی عمر دیکھو۔ کیا تم کام کرو گے؟" وہ غصے سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"بابا مجھے کسی نے بھی نہیں کہا۔ بس مجھے خود ہی خیال آیا۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ لب کاٹتے، اس کے ماتھے پر آئے بال پیچھے کیے اور اپنی گود میں آنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ چلتا ان کی گود میں آ کر بیٹھا۔

"تم کب سے اتنے بڑے ہو گئے ہو آحل؟... آئی ایم سوری بیٹا۔ میں جانتا ہوں تم میری وجہ سے پریشان ہو۔ لیکن دیکھو... ابھی تمہارا باپ زندہ ہے۔ تمہیں کسی بھی چیز کی فکر نہیں کرنی ہے۔ میں جاب ڈھونڈ لونگا کچھ دنوں میں۔ اور گھر کے کام تو میں کر لیتا ہوں

نا۔ پھر بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ میڈ کی ضرورت ہے تو میں وہ بھی رکھ دونگا۔ آئندہ تم ایسی کوئی بات نہیں سوچو گے۔ صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دو گے۔ ٹھیک ہے نا؟" اس نے آگے سے اثبات میں سر ہلایا۔ "چلو اب اترو، میں کھانا بنالوں۔" وہ جلدی سے اتر کر واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ "کیا کھائے گا آج میرا بیٹا؟" وہ فریج کا دروازہ کھول کر اندر چیزیں دیکھ رہے تھے۔

ڈور بیل کی آواز آئی تو آحل کرسی سے اتر کر دوڑتا ہوا گیا۔ واپس آیا تو کمالہ بی بی ساتھ آئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں ایک پلیٹ لیے ہوئے تھیں۔

"اسلام علیکم مَس (بھائی)۔ یہ میں آپ کے لیے کھانا کے کر آئی ہوں۔" انہوں نے وہ پلیٹ وہیں ٹیبل پر رکھی۔ "آپ سے کچھ ضروری بات بھی کرنی تھی مجھے۔" انہوں نے آگے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہارا بہت شکریہ کمالہ۔ چلو آحل تم یہ کھاؤ۔ میں ان کی بات سن کر آتا ہوں۔" وہ دنوں لونگ روم میں آکر بیٹھ گئے تو کمالہ بولنے لگی۔

"نور فیاہ بتا رہی تھی کہ آحل کا یونی فارم بہت گندہ ہوتا ہے۔ اس کی ٹیچر نے اسے ڈانٹا بھی تھا کل۔" کچن کا دروازہ کھلا ہونے کے باعث اندر تک آوازیں جا رہی تھیں۔ اپنا نام سن کر آحل کے ماتھے پر بے اختیار بل آئے۔ کیا ضرورت تھی نور فیاہ کو اپنے گھر میں بتانے کی؟

"مجھے تو آحل نے کچھ نہیں بتایا۔" وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے پھر سر جھٹکا۔ "آحل اب بہت بڑوں کی طرح برتاؤ کرنے لگا ہے۔ وہ ویسا نہیں رہا۔" وہ یاسیت سے بولے۔

"ظاہر ہے جب ایک گھر ٹوٹ جائے پھر پہلے جیسا تو کوئی بھی نہیں رہتا۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ "آپ اپنے اور آحل کے کپڑے مجھے دے دیا کریں۔ میں دھو دیا کروں گی۔"

"نہیں کمالہ تم ہمارا اتنا خیال رکھتی ہو۔ یہی کافی ہے۔ بس مجھے جاب مل جائے تو ایک میڈ رکھ لونگا۔"

"آپ میں بہت خودداری ہے مَس اسفندیار۔ اور انا بھی۔ خیر۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "میں آپ کو ایک مشورہ دونگی۔ اگر آپ اپنے بیٹے کی بھلائی اور خوشی دیکھنا چاہتے ہیں تو کسی سے شادی کر لیں۔ اسے ایک ماں مل جائے گی اور اس گھر کو عورت۔ جانتی ہوں یہ سب آسان نہیں ہے۔ لیکن زندگی کسی کے لیے رکتی تو نہیں ہے نا۔ چھ ماہ گزر چکے ہیں اس بات کو۔ اب آپ کو آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ اپنے بیٹے کی خاطر ہی سہی۔" اسفندیار سر جھکائے خاموش رہا۔ "کہیں تو یہیں کوئی لڑکی ڈھونڈ لوں آپ کے لیے؟"

"نہیں کمالہ۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ شادی صرف ایک دفعہ ہوتی ہے۔ دل کو مہلت صرف ایک دفعہ ملتی ہے۔ آصفہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ وہ بے وفا تھی، میں نہیں ہوں۔" سلگتی آنکھوں سے وہ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے آگے سے صرف نفی میں سر ہلا کر ان کی سوچ پر ماتم کیا۔ لیکن وہ کیا سمجھاتی اس جیسے انسان کو۔

"ٹھیک ہے پھر جیسے آپ کو بہتر لگے۔ چلتی ہوں۔" وہ گہری سانس لیتی اٹھ کر چلی گئی۔ کچن میں بیٹھے آحل نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ کھسکائی۔ اسے کمالہ بی بی پر بے اختیار غصہ آیا تھا۔ کیوں بولا انہوں نے بابا کو کہ شادی کر لیں؟ اگر انہوں نے واقعی شادی کر لی پھر...

اگلے دو مہینے اس نے دیکھا کہ اسفندیار نے ہر جگہ جاب ڈھونڈی لیکن شاید قسمت اس سے پوری طرح روٹھ گئی تھی۔ اس کی ایمبیسی والی جاب اچھی تھی۔ تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن گھر باسانی چل جاتا تھا۔ مگر جب سے آصفہ گئی تھی۔ اس کی حالت اتنی غیر ہو گئی تھی کہ آفس تو جیسے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ بخار میں پھنکتا رہا تھا۔ آحل بیچارہ خود کسی کونے میں پڑا روتا رہتا۔ جب اس کی حالت تھوڑی سنبھلی تو اس نے آحل کو وقت دینا شروع کیا۔ آفس گیا تو خبر ملی کہ وہ اتنی چھٹیاں کرنے کے باعث اسے نکال چکے تھے۔ اس نے بہت منتیں کیں لیکن بے سود۔

کچھ دنوں میں آحل کی فیس کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اسفندیار کے پاس بس اتنی جمع پونجی تھی کہ بمشکل گھر کے خرچے پورے ہو جاتے۔ اس لیے انہوں نے آحل کو اس اسکول سے نکال کر ایک چھوٹے سے اسکول میں داخلہ کروا دیا۔ جہاں فیس بہت کم تھی۔

کچھ عرصے میں ان کو ایک کام بھی مل گیا تھا۔ ان کے شہر میں ایک بہت بڑا فارم تھا۔ گھوڑوں کے استبل کی نگرانی کرنے کے لیے کسی کی ضرورت تھی۔ اور اسفندیار خان نے اپنی شخصیت اور اعلیٰ تعلیم کو پسِ پشت ڈال کر اس کام کے لیے کمر کس لی۔ کوئی بھی کام ہو،

بس انہیں اتنا معاوضہ مل جائے کہ گھر چل سکے اور آحل کی پڑھائی ہو جائے۔ وہ مسئلہ تو ختم ہو گیا لیکن گھر کا بہت برا حال تھا۔

ان کی تنخواہ اب بھی اتنی نہ تھی کہ کوئی میڈ رکھ پاتے۔ انہیں اب آحل کے لیے بھی بہت کم وقت ملتا تھا۔ سارا دن وہ اسٹبل میں گزار لیتے۔ کبھی کبھی آحل اسکول کے بعد ان کے ساتھ چلا جاتا۔ وہیں آحل کو انہوں نے گھڑ سواری بھی سکھائی تھی۔

پھر ایک دن اسفندیار نے اسے اپنے پاس بلایا۔ جانے وہ کیا سوچ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"آحل بیٹا۔ اگر میں شادی کر لوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟" وہ ششدر سا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ یقیناً کمالہ بی بی نے دوبارہ ان سے کوئی بات کی ہو گی۔ تب ہی وہ... "میں جانتا ہوں کہ تمہیں وقت نہیں دے پاتا۔ لیکن کیا کروں بیٹا۔ گھر چلانے کے لیے یہ سب کرنا پڑ رہا ہے۔ اور تمہیں ایک ماں کی ضرورت ہے۔ جو میرے پیچھے تمہارا خیال رکھ سکے، تمہارے کھانے پینے اور کپڑوں کو خیال رکھ سکے۔ تمہاری اپنی ماں کو تو کوئی فکر نہیں تھی، ورنہ وہ سب..."

"آپ بہت برے ہیں بابا۔ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔" آنکھوں میں غصہ لیے وہ ان کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

انہوں نے اسے بہت منانے کی کوشش کی لیکن وہ اب ان سے پہلے کی طرح بات نہیں کرتا تھا۔ چپ چاپ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ پھر ایک دن کمالہ بی بی نے اسے سمجھایا۔

"دیکھو بیٹا۔ میں تمہاری امے کی سب سے اچھی دوست تھی۔ کیا میں چاہوں گی کہ اس کی جگہ کوئی اور لے؟ لیکن میرا بچہ تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ اپنے بابا کی حالت دیکھو، وہ تمہاری وجہ سے کتنے پریشان رہنے لگے ہیں۔ ان کی طبیعت دن بہ دن گھٹتی جا رہی ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ بھی تمہیں اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جائیں؟" اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ "تو پھر ان کے ساتھ اپنی ناراضگی ختم کر دو بیٹا۔ وہ صرف تمہارا فائدہ چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کر لیں وہ شادی۔ لیکن میں انہیں کبھی بھی اپنی امے نہیں مانوں گا۔" وہ آگے سے مسکرا دیں۔ فلحال اتنا ہی کافی تھا کہ وہ مان گیا ہے۔

انہوں نے اسفندیار کو کئی لڑکیوں کے بارے میں بتایا لیکن جو انہوں نے کہا تھا اس کے بعد تو کمالہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ اسی عورت کو اپنے گھر لانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اس کی اور آصفہ کی طلاق ہوئی تھی۔ اس جیسی عورت جانے آحل کے

ساتھ کیا کرتی۔ یہ سوچ کر ہی انہیں خوف آتا تھا۔ اس نے اسفندیار کو بہت سمجھایا لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ آحل سے بہت پیار کرتی ہے اور اس کے لیے بہت اچھی ماں ثابت ہو گی۔ وہ چپ ہو گئیں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

جس دن رینا ان کے گھر آئی تھی، وہ لونگ روم کے باہر کھڑا سن رہا تھا۔ کیسے اس نے اس کے بابا کی توہین کی تھی۔ انہیں اپنے ہی گھر میں بے عزت کیا تھا۔ اس دن سے آحل کی زندگی میں اس عورت کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی زندگی میں ایسی دوغلی اور مطلبی عورت اس نے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد سے اس کا عورت ذات سے بھروسہ ہی اٹھ گیا تھا۔ ایک اس کی ماں تھی جو اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ اور ایک یہ تھی جس نے اس کے باپ کو دو ٹکے کا کر دیا تھا۔

اتنی سی عمر میں اس کے ساتھ اتنا سب ہو چکا تھا کہ اس کا بچپن کہیں کھو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے کبھی بھی بابا کے منہ سے شادی کا لفظ نہیں سنا تھا۔ وہ اب کوشش کرنے لگے تھے کام کے ساتھ اسے اور گھر کو بھی وقت دے سکیں۔ اپنی ذات کو پیچھے رکھ کر وہ سارا سارا دن کام کرتے رہتے تھے۔

اگلے تین سال ایسے ہی گزر گئے۔ وہ اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور گھر آ کر بابا کی تھوڑی بہت مدد کروا دیتا۔ ہر ہفتے وہ اپنی ڈائری لکھتا تھا۔ ایک دن ڈائری لکھتے ہوئے اسے زخرفی انکل یاد آئے۔ ان کی دکان اس نئے اسکول سے تھوڑی دور تھی۔ وہ کبھی کبھی وہاں جا کر اپنے لیے پین یا کاپی لیتا تھا۔

"زخرفی انکل۔ کیا میں یہاں کام کر سکتا ہوں؟" اگلے دن وہ ان کی دکان پر موجود تھا۔ اس کی بات پر وہ ادھیڑ عمر شخص حیران ہوا۔ "آپ نے ایک دن کہا تھا کہ آپ کو کسی کی ضرورت ہے جو دکان میں آپ کی مدد کروا سکے۔ مجھے رکھ لیں نا۔ میں بہت اچھا کام کروں گا اور آپ کو کبھی بھی مایوس نہیں کروں گا۔" وہ آگے سے ہنسنے لگے۔

"لیکن تم تو بہت چھوٹے ہو ابھی۔" انہوں نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

"میں چھوٹا نہیں ہوں۔ کچھ مہینوں میں بارہ سال کا ہو جاؤں گا۔ اور میں آپ سے زیادہ پیسے بھی نہیں لونگا۔ پلیز مجھے رکھ لیں۔" وہ بہت منت کرنے لگا تو انہوں نے ہامی بھر لی۔

اگلے دن ہی وہ ان کی دکان پر موجود تھا۔ اس طرح اس نے اتنی سی عمر میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہاں سے جو تھوڑے بہت پیسے ملتے تھے، اس نے وہ اپنے پاس جمع کرنا شروع کر دیے۔ بابا کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ ناراض ہوں گے۔

لیکن اسے بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ جانتے تھے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو بہت اچھے سے جانتے ہیں۔ وہ کس وقت کیا کرتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں، انہیں معلوم ہوتا ہے۔

انہوں نے آحل کو نہیں روکا۔ وہ سارا دن گھر میں اکیلا ہوتا تھا، کہیں مصروف ہو جائے تو اسے بھی تسلی رہے گی۔ اور پھر اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ غلط دوستوں اور لوگوں میں بیٹھنے سے اچھا تھا کہ کوئی کام کرتا۔

دن تھوڑے بہتر ہونے لگے تو انہوں نے اس کا داخلہ واپس اسی اسکول میں کروا دیا۔ اسکول سے وہ زخرفی انکل کی دکان پر جاتا۔ اسفندیار روز فارم سے واپسی پر اسے دکان سے لینے جاتے تھے اور ہر دن زخرفی انکل سے اس کی رپورٹ لیتے رہتے تھے۔ وہ ان والدین میں سے نہیں تھے جو بچوں سے غافل رہتے ہیں۔ انہیں تو اس کا کام کرنا بھی پسند نہیں تھا لیکن اسی میں اس کی بہتری تھی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

اب احمد سے اس کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بہت اچھا دوست ثابت ہوا تھا، بس صرف ایک بات جو آحل کو اس میں بری لگتی تھی۔ وہ نورفیاہ کے آگے پیچھے گھومتا تھا۔ اور وہ آگے سے گھاس تک نہیں ڈالتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو دنیا کی تمام لڑکیوں کو کہیں غائب کر دیتا۔ جانے کس بنا پر اتنا اتراتی تھیں۔ وہ احمد کو بہت سمجھاتا تھا، لیکن وہ کوئی اثر نہیں لیتا تھا۔

اسکول میں اس کے گریڈز بہت اچھے آتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی کلاس میں خاصہ مشہور بھی ہو گیا تھا۔ کچھ سال پہلے جو بچے اس سے دور دور رہتے تھے۔ اب اس سے دوستی کے خواہش مند ہوتے تھے۔ والدین کی طلاق کا جو دھبہ اسے کہیں منہ دکھانے لائق نہ

چھوڑ تا تھا اب وہ آہستہ آہستہ مندمل ہو تا جا رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب اس بات کو بھول گئے تھے۔

لیکن وہ کیسے بھول جاتا؟ اپنی ماں کو کیسے بھول جاتا؟ آٹھ سال تک جنکی گود میں وہ پلا بڑھا تھا۔ ایک دم سے ان کا سایہ اس سے چھن گیا تھا۔ وہ امے کے ساتھ سب سے زیادہ عادی تھا۔ ان کے جانے کے بعد اس کے اندر سے لاابالی پن پوری طرح ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

اسے کبھی کبھی آیت پر غصہ آتا تھا۔ کاش وہ چھوٹا ہوتا تو امے اسے اپنے ساتھ لے جاتیں۔ مگر جب اس دو سالہ چھوٹی سی گڑیا کا تصور نظروں میں آتا تو اسے بے ساختہ پیار سا آنے لگتا تھا۔

وہ چھ سال کا تھا جب آیت پیدا ہوئی تھی۔ وہ دن اس کی زندگی کا بہت خوبصورت دن تھا۔ اس نے اس ننھی سی جان کو دیکھتے ہی اس کا نام گڑیا رکھ دیا تھا۔ وہ اسکول سے آنے کے بعد اسے گود میں لیے اس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ امے کے ساتھ اس سے وہ بھی چھن گئی تھی۔ اس کی زندگی میں موجود ہر عورت اس سے دور ہو جاتی تھی۔ اس لیے اس نے کبھی اسکول میں کسی لڑکی سے دوستی بھی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ لڑکیوں سے ایک کنارہ بنائے رکھتا تھا۔

میٹرک کرنے کے بعد اس نے اسی اسکول میں کالج بھی پڑھا۔ اس دوران اس نے زخرفی انکل کی دکان کو چھوڑ کر بہت سارے چھوٹے بڑے کام کیے تھے۔ وجہ پیسے نہیں ہوتے تھے۔ بابا کی تنخواہ اب اتنی تھی کہ ان دونوں کا خرچہ باسانی پورا ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ گھر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ خالی گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ امے اور آیت کی یاد سے بچنے کے لیے وہ زیادہ وقت کام میں ہی مصروف رہتا تھا۔

نوعمری کے اس دور میں جہاں باقی لڑکے عیاشیاں کرتے ہیں۔ ماں باپ کا پیسا لوٹتے ہیں اور پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ وہ تب بھی بہت باشعور تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ آگے کی پڑھائی کے لیے اسے اچھی خاصی رقم کی ضرورت پڑے گی۔ اور وہ رقم ابھی سے جمع کر رہا تھا۔ لیکن اتنا شعور خود سے ہی نہیں آجاتا انسان میں۔ اتنی آسانی سے کوئی بھی بچہ بڑا نہیں ہو جایا کرتا۔ ان کی تربیت اور ذہن سازی کرنی پڑتی ہے۔

اور اس کی اس شخصیت کا سارا کمال اسفندیار خان کی وجہ سے تھا۔ وہ اچھے شوہر شاید نہیں تھے۔ لیکن بلاشبہ ایک اچھے باپ ثابت

ہوئے تھے۔ آصفہ کے جانے کے بعد کچھ مہینے وہ اس سے بے خبر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد سے وہ آحل کے لیے ماں اور باپ دونوں ہی بن گئے تھے۔ نہ صرف اس کی ساری ضروریات پوری کرتے تھے بلکہ اس کی تربیت پر بھی اچھا خاصا دیہاں دیتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ انہیں اپنی غلطیوں کا اندازہ بہت اچھے سے ہو گیا تھا۔ رینا نے کیسے ان کی ہنستی کھیلتی زندگی کو برباد کیا تھا، اب بلکل واضح نظر آتا تھا۔ لیکن اب ان کے پاس پچھتانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ غصے میں کیے گئے فیصلے زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ آصفہ اس کی زندگی میں واپس نہیں آسکتی تھی۔ اب صرف آحل تھا اس کے پاس جو ان کی پوری زندگی کا حاصل تھا۔ اور وہ اسے بلکل اپنی ماں کی طرح بنانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا ان کی طرح بنے یا اپنی زندگی میں ان جیسی غلطیاں کرے۔

"تمہاری ماں بہت اچھی عورت تھی آحل۔ انہیں تم سے بہت محبت تھی۔ ان کے بارے میں کبھی بھی غلط مت سوچنا۔" ایک دن جب آحل کو امے سے گلہ ہوا تو وہ اسے بہت پیار سے سمجھانے لگے۔

"اگر وہ اتنی ہی اچھی تھیں تو مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟"

"وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں گئی تھی آحل۔ میں نے اسے چھوڑا تھا۔ وہ میری غلطی تھی جسے ہم سب بھگت رہے ہیں۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بول رہے تھے۔ "مجھے معاف کر دو میرے بچے، میں نے تمہارا بچپن برباد کر دیا۔"
"نہیں بابا۔ یہ کیا کر رہیں ہیں آپ۔" اس نے ان کے جڑے ہوئے ہاتھ کھولے۔ "غلطیاں تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں ناں۔ اور مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ آپ نے تو مجھے ماں باپ دونوں بن کر پالا ہے۔ میرا تو سب کچھ اب آپ ہی ہیں۔"

"کاش کہ میں تمہاری ماں اور بہن سے کبھی معافی مانگ سکتا۔ میرا ضمیر مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا آحل۔ وہ دونوں مجھے معاف کر دیں تو میں سکون سے قبر میں جا سکوں گا۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ اس کا تو دل ہی کٹ کر رہ گیا تھا۔

"بابا۔ ایسا تو مت کہیں۔ میرا آپ کے علاوہ اس دنیا میں کون ہے؟ آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو میں کہاں جاؤں گا؟" وہ نو عمر سا آحل بہت دھیرے سے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

وہ بہت کم اس طرح آحل کے سامنے ٹوٹتے تھے۔ اور اس دن آحل کو احساس ہوا تھا کہ وہ اپنی عمر سے بہت زیادہ دکھنے لگے تھے۔ بظاہر وہ کہتے نہیں تھے، لیکن ان کی طبیعت دن بہ دن پستہ ہوتی جا رہی تھی۔

سیکنڈ ائیر میں اس کے بہت اچھے گریڈز آئے تھے۔ بابا چاہتے تھے کہ وہ یورپ کی کسی اچھی سی یونیورسٹی سے انجنیئرنگ کرے۔

لیکن وہ انڈونیشیا کی ہی کسی یونی ورسٹی میں ایڈمشن لینا چاہتا تھا۔ وہ ان پر اتنا بوجھ ہرگز نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی ان کی ذہنی حالت اور صحت جواب دینے لگی تھی۔ مگر وہ پر اصرار تھے۔ انہوں نے اپنے دوست، وکال انداہ سری کے ذریعے سے آحل کا ایڈمیشن سٹین فورڈ میں کروا دیا۔

اسے بہت آسانی سے وہاں داخلہ مل گیا تھا۔ وجہ اس کے اچھے گریڈز اور وکال انداہ سری کا ہونا تھا۔ ان کی وجہ سے اسے سکالرشپ پر امریکہ میں پڑھائی کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ ان کا بہت ممنون تھا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

وہ ابھی کچھ دیر پہلے ائیر پورٹ پہنچا تھا۔ ہاتھ میں اپنا بیگ لیے وہ ائیر پورٹ میں چل رہا تھا۔ سیاہ شرٹ کے اوپر بھورا کوٹ، جینز اور بھورے شوز پہنے، بھورے بال ماتھے پر اور ہلکی ہلکی شیو میں وہ بہت پرکشش لگ رہا تھا۔ اندر سے البتہ وہ ذرا نروس تھا۔ پہلی دفعہ ملک سے باہر، وہ بھی بلکل اکیلے۔ کیلیفورنیا بہت خوبصورت، رنگوں اور روشنیوں سے بھرا شہر تھا۔ یہاں وہی آسمان تھا لیکن زمین انڈونیشیا سے بہت مختلف تھی۔ یہاں آکر اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونا تھا۔ اچھا یا برا یہ تو وقت نے طے کرنا تھا۔

وہ ائیر پورٹ سے سیدھا یونی ورسٹی پہنچا تھا۔ تھوڑی بہت مشقت کے بعد اسے اپنا ڈورم مل گیا۔ اس کے تین روم میٹس تھے۔ اس نے سلام دعا کے علاوہ ان سے کوئی بھی بات نہیں کی تھی۔ اس کی عادت نہیں تھی زیادہ بولنے کی۔ باتیں کرنا وہ کافی عرصہ پہلے ترک کر چکا تھا۔ اگلے دو دن ایڈمن کے چکر لگاتے گزر گئے اور اس کے بعد اس کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔

وہ باقاعدگی سے ساری کلاسز لیتا تھا لیکن اب تک اس کی کسی سے دوستی نہیں ہو پائی تھی۔ وہ خود ہی اکیلا بیٹھا رہتا، اگر کوئی خود آکر بات کر لیتا تو وہ جواب دے کر دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔

"ہیلو! کیا تم ترکش ہو لڑکے؟" ابھی سر کے آنے میں تھوڑی دیر تھی۔ وہ اپنے رجسٹر پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا جب اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ایک لڑکی اس سے انگریزی میں مخاطب ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کندھوں تک آتے سیاہ بالوں والی سٹائلش سی، گندمی رنگت اور مناسب نقوش والی لڑکی تھی۔ وہ کسی ایشین ملک کی لگتی تھی۔

"نہیں۔" اس نے سرسری سا جواب دیا پھر چپ ہو گیا۔ اسے خود کو دیکھتا پا کر اس نے سر اٹھایا۔ "میں پاکستانی ہوں!" اس کا جواب سن کر اس لڑکی کا تو مانو منہ ہی کھل گیا۔

"اوہ!" اسے جیسے گہری مایوسی ہوئی۔ "ویسے تم تو ترکش لگتے ہو۔ خیر... آئی ایم کومل۔ اور میں انڈین ہوں۔" اس نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے کچھ لمحے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر لمبی سانس لے کر پیچھے ہوا۔

"میں آحل اسفندیار خان!... نائس ٹو میٹ یو لیکن میں لڑکیوں سے ہاتھ نہیں ملاتا۔" اور کومل کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ اس کا کِھلا ہوا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا تھا۔

"کیا تم یہیں رہتے ہو؟ یا پھر پاکستان سے صرف پڑھنے کے لیے آئے ہو؟" وہ پھر سے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئی بولی۔ آحل نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بلاوجہ اس سے اتنی فری ہو رہی تھی۔ اسے اس لڑکی سے عجیب سی کوفت محسوس ہوئی۔

"آپ..." اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتا، سر کلاس میں آ گئے تھے۔ وہ اسے نظر انداز کیے لیکچر سننے لگا۔

کومل گاہے بگاہے اس وجیہہ چہرے والے مغرور سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل پہلی نظر میں ہی عجیب سے انداز میں اس کی طرف کھنچا تھا۔ وہ لڑکا شروع دن سے الگ بیٹھا رہتا تھا۔ اور کام کے علاوہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ لڑکیاں تو درکنار، وہ لڑکوں میں بھی زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اور اس کی یہی بات اسے سب سے الگ اور پرکشش بناتی تھی۔

رات کو آحل اپنے روم میں اکیلا تھا۔ باقی روم میٹس شاید کسی سیمینار میں گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا فون پر گیم کھیل رہا تھا جب اسے باہر سے کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ پہلے تو وہ نظر انداز کرتا رہا لیکن جب شور زیادہ ہوا تو وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔

کاریڈور میں ایک لڑکی غصے سے اپنے سامنے کھڑے لڑکے پر چلا رہی تھی۔

"صرف تمہاری وجہ سے میرا ماما سے جھگڑا ہوا ہے۔ انہیں لگتا ہے میرا تم سے افیئر چل رہا ہے۔ تمہیں تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی حمزہ کے بچے!" وہ چیختے ہوئے اس کی طرف حملہ کرنے کے لیے بڑھی تو وہ اس سے جان بچاتا ہوا ادھر ادھر بھاگنے لگا۔

"قسم لے لو یار، میں نے صرف ایک مذاق کیا تھا۔" وہ ہنس رہا تھا۔ "ارے تم تو واقعی مجھے مار کر ہی چھوڑو گی۔ کوئی تو بچاؤ مجھے اس چڑیل سے۔" وہ دہائیاں دیتا ہوا آحل کے پیچھے جا کر چھپنے لگا۔ اور وہ ہونق سا اس پاگل کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں اردو بول رہے تھے۔

"ادھر سامنے آؤ ذرا میں بتاتی ہوں تمہیں۔" وہ غصے سے ہر لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

"واٹ از دس نان سینس؟" آحل نے ایک جھٹکے سے اس لڑکے کو خود سے ہٹایا۔

"سوری برو!" وہ دانت نکالتے ہوئے چہرے پر معصومیت سے بولا۔ آحل نے اپنا کندھا جھاڑا۔ وہ لڑکی غصے سے تن فن کرتی ہوئی چلی گئی۔ لڑکا بھی جانے لگا تھا کہ پیچھے سے آحل نے آواز دی۔

"اے!... تم پاکستانی ہو؟" وہ اردو میں اس سے مخاطب ہوا۔ وہ لڑکا ایک دم مڑا اور آنکھوں میں چمک لیے آگے آیا۔

"اس کا مطلب تم بھی پاکستانی ہو! ہے ناں؟"

"ہوں۔"

"ارے تم تو آحل اسفندیار خان ہو۔" وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا تو آحل کی تیوری چڑھی۔ وہ کیسے جانتا تھا اس کا نام؟

"میں حمزہ بہرام علی، تمہارا کلاس فیلو۔" اس نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ "فرسٹ کلاس میں جب تم نے اپنا انٹرو دیا تھا تب مجھے تمہارا نام پتا چلا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم میرے ہی بلاک میں ہوتے ہو۔"

"اوہ اچھا۔" آحل نے اس کا ہاتھ تھاما۔ "یہ تمہاری دوست تھی؟"

"کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ دوستی مجھے مہنگی پڑنے لگی ہے۔ پتا ہے مجھے تو لڑکیاں چڑیلیں لگتی ہیں۔" وہ آگے ہو کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "دیکھا تم نے کیسے مجھے مار رہی تھی۔"

"تم نے کچھ تو کیا ہو گا۔" وہ آگے سے چہرے پر بلا کی معصومیت طاری کیے کان کھجانے لگا۔

"اصل میں کل میں اس کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس کی کھڑکی میں پھول پھینک دیا۔ اس کی ماں نے مجھے دیکھ لیا تو میں وہاں سے بھاگ گیا۔ پیچھے سے اس کی شامت آگئی۔ اب وہی قرض اتارنے کے لیے مجھے مارنے کو دوڑ رہی ہے۔ بھئی میں نے تو ایک مزاق کیا تھا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ جیسے اس نے تو کچھ کیا ہی نہ ہو۔ آحل آگے سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

"چلو میں چلتا ہوں۔ کلاس میں ملاقات ہو گی۔" وہ اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ وہ کافی دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر جھرجھری لے کر اپنے روم میں آیا۔ پتا نہیں کیسے کیسے پاگل ہوتے ہیں دنیا میں۔

اور یہ سوچتے ہوئے اسے یہ اندازہ کب تھا کہ اس پاگل کو اسے اگلے چار سال تک جھیلنا پڑے گا۔ اور اسی کی بدولت اس کے یہ چار سال خوبصورت ترین ہونے والے تھے۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

اگلے ہی دن حمزہ کلاس میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ وہ بہت زیادہ بولتا تھا۔ لیکن اچھا لڑکا تھا۔ کلاس میں سب سے باتیں کرتا تھا اور ہر ضرورت مند کی مدد کرتا تھا۔ اگلے ایک دو مہینوں میں اس کی آحل سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کا گھر یہیں کیلیفورنیا میں تھا لیکن یونیورسٹی سے دور پڑتا تھا۔ اسی لیے وہ ہاسٹل میں رہائش پزیر تھا۔

اس کا سوشل سرکل بہت بڑا تھا اور اس کی وجہ سے آحل کی یہاں کافی لوگوں کے ساتھ جان پہچان ہو گئی تھی۔ ہر ویک اینڈ پر وہ آحل کو لیے پورا شہر گھماتا تھا۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں وہ اسے اپنے ساتھ گھر بھی لے جاتا تھا۔ لیکن آحل وہاں بہت غیر آرام دہ

محسوس کرتا تھا۔

"یہ دس دن تم یہاں اکیلے کیوں گزارنا چاہتے ہو؟ تمہیں میرے ساتھ آنے میں آخر کیا مسئلہ ہے آحل؟" حمزہ اپنے بیگ میں سامان قریباً ٹھونستے ہوئے اسے غصے سے دیکھ رہا تھا جو لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ آحل کے روم میں ایک فرد کی جگہ ابھی خالی تھی۔ سو دوسرا سمسٹر شروع ہوتے ہی حمزہ اپنا روم بدلوا کر اس کے روم میں آگیا تھا۔

"میری فکر نہیں کرو۔ میں یہاں بہت آسانی سے دس دن گزار سکتا ہوں۔ اور ویسے بھی میں حسن لوگوں کے ساتھ گھومنے کا سوچ رہا ہوں۔" کندھے اچکا کر وہ بڑے آرام سے بولا۔ دوسرے سمسٹر کے امتحان ہو گئے تھے اور اب انہیں دس چھٹیاں ملی تھیں جس میں سب انٹرنیشنل طلباء گھومنے پھرنے کا سوچ رہے تھے۔ ان کے روم میٹس، حسن اور ہیری بھی شہر کے آس پاس کہیں گھومنے جا رہے تھے۔ حسن سعودی عرب سے تعلق رکھنے والا ایک سیاہ فام تھا جب کہ ہیری ایک کینیڈین یہودی تھا۔ ہیری کا مذہب ان تینوں سے الگ تھا لیکن وہ اچھے دوست تھے۔ حسن اور ان دونوں کو ہیری کی دوستی میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ آحل ان دونوں کے ساتھ جانے کا سوچ رہا تھا مگر حمزہ اسے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد تھا۔ وہ اپنے بھائی (جنید) کی شادی کے لیے گھر جا رہا تھا۔

"آہاں!... اور گھومنے کے پیسے کہاں سے آئیں گے جناب کے پاس؟" وہ کسی لڑاکا عورت کی طرح کمر پر ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

"تم شاید بھول رہے ہو کہ تمہارا دوست اب بے روزگار نہیں ہے۔ اتنی جمع پونجی تو ہے میرے پاس کہ ایک دو شہر گھوم سکتا ہوں۔"

آحل مسکرا کر خود کو داد دینے والے انداز میں بولا۔ یونی ورسٹی کے خرچے بہت زیادہ تھے اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے بابا کو تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک مال میں جوتوں کی دکان میں جاب شروع کر دی تھی۔ وہ کلاسز لینے کے بعد شام میں سیلز مین کا کام کرتا تھا جس میں تھکن تو تھی لیکن اس جیسے انسان کے لیے یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اس کے ہاتھ تو بچپن سے ہی مختلف کام کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن ہم سب اکٹھا جائیں گے۔ پہلے گھر چلیں گے۔ اور بھائی کی شادی کے بعد ہم کسی اچھی سی جگہ جا رہے ہیں۔ اینڈ دیٹس فائنل مسٹر آحل۔ اپنا سامان پیک کرو۔"

اور حمزہ بہرام کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ وہ ایک دفعہ کچھ کہہ دیتا تو کر کہ ہی رہتا تھا۔ ناچاہتے ہوئے بھی آحل کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔ شروع کے تین چار دن جنید بھائی کی شادی کی تقریبات میں گزر گئے۔ اس کے بعد وہ لوگ سیر کو نکل گئے۔

شام کو وہ چاروں کیلیفورنیا سے تھوڑے فاصلے پر واقع ایک شہر سینٹا مانیکا پہنچے تھے۔ ہیری کا ایک دوست اسی شہر میں رہائش پزیر تھا سو وہ لوگ اسی کے گھر میں رکے تھے۔ تھکن اتنی تھی کہ آتے ساتھ ہی کھانا کھا کر وہ لوگ سو گئے تھے۔ اگلی صبح وہ لوگ سینٹا مانیکا

کے ساحل کو چل پڑے تھے۔ وہ ایک خوبصورت سمندری ساحل تھا۔ کچھ دیر وہ لوگ وہاں انجوائے کرتے رہے۔

"آحل... تمہاری گرل فرینڈ یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔" حسن ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آحل نے غصے سے اس کے چہرے کو دیکھا جو بائیں جانب مڑا ہوا تھا۔ سامنے کچھ لڑکیاں کھڑی ایک دوسرے کو تصاویر کھینچ رہی تھیں۔ انہی میں اس کی کلاس فیلو، کومل بھی تھی۔

"شٹ اپ حسن! اس طرح کسی پر الزام لگانے سے پہلے کچھ سوچ لیا کرو۔ وہ ایک لڑکی ہے۔"

"اب گرل فرینڈ لڑکا تو ہونے سے رہی۔" حسن کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے اسے دیکھتا رہا۔ "مزاق کر رہا ہوں یار۔ لیکن دیکھو نا وہ خود ہی تو ہر جگہ تمہارے پیچھے پیچھے آجاتی ہے۔ کبھی ہمارے بلاک میں نوٹس مانگنے آجاتی ہے، کبھی تمہاری کلاس میں، کبھی گراؤنڈ میں اور اب دیکھو یہاں بھی پہنچ گئی۔" اس کی بات پر حمزہ اور ہیری بھی ہنسنے لگے۔ آحل نے سر جھٹکا۔ "ویسے مجھ سے پوچھو تو

لڑکی اچھی ہے، تم اس سے دوستی کیوں نہیں کر لیتے؟ کیوٹ ہے۔ اور معصوم بھی۔ اوپر سے تمہارا ڈائی ہارٹ فین!"

"مجھے کوئی شوق نہیں کسی لڑکی سے دوستی کرنے کا۔" اس نے کڑوا سا منہ بنایا۔

"ابھی تو تم بڑا اسکا ساتھ دے رہے تھے کہ لڑکی ہے۔ یہ وہ۔"

"وہ صرف ایتھکس ہیں۔ ایتھکس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہر کسی سے دوستی کرتا پھرے۔ خیر چھوڑو اسے۔" اس نے موضوع بدل دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہیری اور حسن کچھ کھانے کے لیے لانے کو اٹھ گئے تھے۔ حمزہ وہیں بیٹھا اس کے ساتھ ویڈیوز بنا رہا تھا کہ کومل ان کی طرف آتی دکھائی دی۔

"ہیلو بوائز!" شولڈر کٹ بالوں کو ایک ہاتھ سے پیچھے کرتی وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"ہائے پریٹی گرل! تم یہاں کیسے؟" حمزہ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں اپنی فرینڈز کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔ کیا تم لوگ بھی؟" حمزہ نے سر اثبات میں ہلایا۔

"میری فرینڈز کھانے کے لیے چلی گئی ہیں۔ اور مجھے ابھی بھوک نہیں، کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے آحل کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے زبردستی مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ حمزہ کے فون پر کال آنے لگی تو وہ آحل کو آنکھ مارتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

"خبیث انسان!" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔ کچھ لمحے خاموشی میں بیت گئے۔ آحل چپ چاپ سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہروں کو دیکھتا رہا۔

"کیا تمہیں ساحل پسند ہے؟" وہ خاموشی کو توڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے سمندر پسند ہے۔ لیکن یہاں کا سمندر اتنا اچھا نہیں جتنا انڈونیشیا کا۔" وہ بے دیہانی میں سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"واؤ۔ تم انڈونیشیا بھی گئے ہو؟" اس نے مڑ کر کومل کو دیکھا اور پھر ہلکا سا ہنسا۔ ہنستے ہوئے اسکی آنکھوں کے کناروں پر بنتی وہ لکیریں بہت پرکشش لگتی تھیں۔ کومل کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا۔

"میں تو انڈونیشیا میں ہی رہتا تھا۔ پاکستان تو صرف بچپن میں ایک دو دفعہ گیا ہوں۔"

"اچھا۔ انڈونیشیا کیسا ملک ہے؟ مجھے بتاؤ نا اس کے بارے میں..." وہ اس سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھنے لگی۔ آحل نہ چاہتے ہوئے بھی اسکے جواب دیتا رہا۔

یہ ان کی پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ جس میں کچھ خاص باتیں تو نہیں ہو پائی تھیں لیکن ان دونوں کے درمیان ایک پُل ضرور بنا گئی تھی۔ اس کے بعد کومل اکثر اس سے ملنے آتی۔ ڈھیر ساری باتیں کرتی رہتی۔ باقی تینوں سے بھی اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ان کے گروپ کا حصہ بنتی گئی۔

شروع میں آحل اس کی موجودگی میں غیر آرام دہ محسوس کرتا تھا۔ لیکن پھر وقت کے ساتھ وہ نارمل ہونے لگا۔ اسے اب وہ بری نہیں لگتی تھی۔ وہ واقعی اچھی لڑکی تھی، چلبلی اور معصوم سی۔ اور پھر اسے اس کی دوستی میں کوئی برائی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ لوگ اچھے دوست بن گئے تھے۔ اور پھر دھیرے دھیرے یہ دوستی پسندیدگی میں بدل گئی۔ کومل تو اسے شروع سے پسند کرتی تھی، اس بات کا اندازہ اسے بخوبی تھا۔ لیکن اب، اس کی صحبت میں رہ کر، اس کی چھوٹی چھوٹی معصوم حرکتیں دیکھ کر وہ خود بھی اس کی طرف مائل ہونے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی حیران ہوتا تھا کہ کیسے ایک لڑکی کو وہ اتنا وقت اگنور کرتا رہا، وہ اسے بلکل اچھی نہیں لگتی تھی اور اب... وہ اس کی پسند بن گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے اس کا وقت بہت خوشگوار گزرتا تھا۔

بچپن سے اب تک اس کی زندگی میں جو محرومیاں تھیں، وہ کہیں زائل ہونے لگی تھیں۔ زندگی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ وہ ایک اچھی یونی ورسٹی میں پڑھائی کر رہا تھا۔ اتنے اچھے دوست ملے تھے۔ بابا بھی خوش تھے، وہ چھٹیوں میں ان سے ملنے جاتا تھا۔ جاب بھی مل گئی تھی اور زندگی گزارنے کے لیے اچھی ساتھی بھی۔ اس سے زیادہ کی اس نے کبھی چاہ بھی نہیں کی تھی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

ایک دن کومل اس کے ساتھ یونی ورسٹی کے گراؤنڈ میں بیٹھی تھی۔ جانے کیا خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

"آحل۔ کیا تم مجھے پسند کرتے ہو؟" ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے، چمکتی آنکھوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ سفید ٹی شرٹ کے نیچے سیاہ ٹراؤزر اور سیاہ بال چھوٹی سی پونی میں بندھے ہوئے تھے۔ گندمی رنگت پر ہلکا سا میک اپ بہت جچ رہا تھا۔

"ایک سال سے میں ہر جگہ تمہارے ساتھ پایا جاتا ہوں۔ کیا اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے میں تمہیں پسند کرتا ہوں یا نہیں؟" وہ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"جانتی ہوں لیکن میں محبت کی بات کر رہی ہوں۔ تم نے کبھی بھی مجھے ایسا نہیں کہا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"دیکھو کومل۔ میرے لیے محبت کوئی عام جذبہ نہیں، جسے یونہی کہہ دیا جائے۔ جب تک آپ خود شیور نہیں ہوتے، کہہ دینا بے کار

ہے۔اور جب تک ہم کسی انسان کے ساتھ کافی عرصہ رہ نہیں لیتے، یہ طہ کرنا مشکل ہے کہ محبت ہے یا نہیں۔ سو فلحال یہ اقرار میں نہیں کر سکتا۔ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ تم مجھے اپنے ساتھ ہمیشہ وفادار پاؤ گی۔ ہر قدم پر۔" وہ آگے سے مسکرائی تھی۔اس کی آنکھوں میں خوشیاں تیرنے لگی تھیں۔

"لیکن میں تو بلکل شیور ہوں۔ میں دس ہزار دفعہ بھی یہ کہہ سکتی ہوں آحل اسفندیار خان کہ مجھے تم سے محبت ہے۔اور میں سب کے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوئی اور کھکھلا کر اونچا اونچا بولنے لگی تو آحل بے اختیار کھڑا ہو کر اسے روکنے لگا۔

"شش۔ آہستہ بولو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا۔ سب دیکھ رہے ہیں۔" وہ لوگوں کو دیکھتے ہوئے ہلکی آواز میں بولا۔

"ہاں تو دیکھنے دو۔ سب کو پتا ہونا چاہیئے کہ ہم کپل ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "سنو لوگوں... مجھے آحل اسفندیار سے محبت ہے۔" وہ اونچا اونچا بولی تو سب مڑ مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ لیکن وہاں شاید ہی کسی کو اس کی بات سمجھ آئی ہو گی۔

"یہ سب تمہیں پاگل سمجھ رہے ہیں۔ چلو یہاں سے۔" وہ اسے گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔اور وہ ہنستی چلی گئی۔اور یہ سب کرتے ہوئے آحل کو وہ واقعی کوئی پاگل لگ رہی تھی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

یونی ورسٹی کی مسلم کمیونٹی نے آج ایک چھوٹا سا سیمینار ارینج کیا تھا۔ جس میں کچھ معزز سپیکر تقریر کے لیے آنے والے تھے۔وہ ایک چھوٹا سا ہال تھا جہاں سب قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔وہ ایک کونے میں حمزہ اور حسن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

"یار کہاں لے آئے ہو حسن۔ کب شروع ہو گا یہ سیمینار۔ مجھے تو نیند آنے لگی ہے۔" حمزہ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"بس ابھی شروع ہو جائے گا۔ عبداللہ بن مسعود بس آتے ہونگے۔ وہ بہت اچھے سپیکر ہیں۔ انہی کے لیے میں تم لوگوں کو یہاں لایا ہوں۔" حسن بہت نیک اور عملی مسلمان تھا۔ وہ اکثر ایسی جگہوں پر پایا جاتا تھا۔اور آج ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ لایا ہوا تھا۔ آحل چپ چاپ بیٹھا انتظار کر رہا تھا جبکہ حمزہ کی ہمت اب ختم ہونے لگی تھی۔ وہ لوگ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور ابھی سیمینار شروع نہیں ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد عبد اللہ بن مسعود آ گئے تھے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر سیاہ فام عربی تھے۔ یقیناً اسی لیے حسن کی ان سے جان پہچان تھی۔ وہ بہت خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان تھے۔ سلام دعا کے بعد وہ وہیں قالین پر بیٹھ گئے۔

"اس محفل کو ہم اللہ کے پاک نام سے شروع کرتے ہیں۔" انہوں نے بآواز بلند بسم اللہ پڑھی۔ باقی سب نے انکی تلقین کی تھی۔ "ہم یہاں اللہ کی باتیں کرنے آئیں ہیں، سو سب سے پہلے مجھے آپ لوگ بتائیں، کہ اللہ ہے کون؟"

"اللہ ہمارا رب ہے۔" کسی کی آواز آئی۔

"اللہ ہمارا خالق ہے۔" سب ایک ایک کر کے بتانے لگے۔ وہ مسکرا کر انہیں دیکھتے رہے۔

"بلکل۔ آپ سب درست کہہ رہے ہیں۔ لیکن اللہ کا تعارف آپ کیسے کریں گے؟ کسی غیر مسلم سے آپ اپنے اللہ کا تعارف کیسے کروائیں گے؟ یہ تو وہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمان اللہ کو اپنا رب اور خالق مانتے ہیں۔ ایسے تو وہ بھی بہت سی چیزوں کو اپنا رب مانتے ہیں، خالق مانتے ہیں۔ آپ فرق کیسے کرائیں گے؟"

وہاں خاموشی چھا گئی۔ کسی کو ایسا جواب نہیں سوجھا تھا جو انہیں قائل کر دیتا۔ وہ مسکرائے اور پھر ذرا آگے ہوئے اور دھیمی پر اثر آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"اللہ ایک ہے!... اللہ اپنی ذات، صفات میں صرف ایک ہے۔ یہ اس کی سب سے خوبصورت پہچان ہے۔ اس کل کائنات میں صرف اور صرف اللہ وہ ذات ہے جو اکیلی ہے۔ جس کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ ذات جو کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے بھی تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ جسے کوئی زوال نہیں۔ یہ کائنات، اس میں موجود ہر ایک ذرہ اس کا ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ سب سے طاقتور ہے۔ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ وہ خالق ہے۔ وہ مالک ہے۔ وہ رازق ہے۔ کیا کسی اور کے پاس ہیں یہ سب خصوصیات؟ کیا کسی غیر مسلم کے بنائے ہوئے جھوٹے خداؤں کے پاس یہ سب خصوصیات ہیں؟ نہیں۔ یہ سب صرف ایک اللہ کے پاس ہے۔

اللہ نور ہے۔ وہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ نور کہتے ہیں روشنی کو۔ اور روشنی کیا کرتی ہے؟"

"چیزوں کو روشن کرتی ہے۔" پیچھے سے کسی کی آواز آئی تھی۔

"روشنی... اندھیرے کو ختم کرتی ہے، تاریک راستوں کو منور کرتی ہے۔ ہمیں راستہ دکھاتی ہے۔ ہمارے پاس روشنی ہو تو ہمیں کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ وہ ہمیں کہیں نہ کہیں سے راستہ دکھا دیتی ہے۔ ہمیں بس اس روشنی کو پانا ہے۔ اللہ کو پانا ہے۔ جتنا زیادہ ہو سکے ہمیں یہ نور اپنی زندگیوں میں سمیٹنا ہے۔"

"لیکن زیادہ روشنی سے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہے ناں۔" ایک نوجوان لڑکا بولا تو وہ مسکرائے۔

"روشنی کو سامنے سے دیکھو گے، اس کے آگے ڈھیٹ بن کر کھڑے رہو گے تو آنکھیں چندھیا ہی جائیں گی ناں میرے بچے... روشنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہٹ دھرمی نہیں دکھائی جاتی۔ بلکہ اسے مضبوطی سے پکڑ کر اس کے دکھائے ہوئے راستوں پر چلا جاتا ہے۔ یہ دنیا، ایک تاریکی ہے۔ جس میں روشنی صرف اللہ کی ذات سے ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر اس کے دکھائے ہوئے رستوں پر چلتے ہیں۔ وہ دنیا اور آخرت، دونوں کو فتح کر لیتے ہیں۔ وہ نہ کبھی گرتے ہیں، نہ انہیں دنیا کا کوئی خوف ہے۔ اور نہ وہ کبھی غمگین ہونگے۔ یہ میرے پیارے اللہ کا وعدہ ہے!" وہ تھوڑی دیر سانس لینے کو رکے۔

"آپ لوگ میرے بچوں، نوجوان نسل ہیں۔ یہ دنیا آپ سے ہے، آپ اسے اپنے طریقے سے خوبصورت بھی بنا سکتے ہیں اور بدصورت بھی۔ ابھی آپ کی زندگی میں بہت کچھ آنا ہے۔ ہر موڑ پر اللہ کا نور تھامیں گے تو وہ آپ کو کبھی کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیگا۔ وہ ہر جگہ آپ کا ساتھ دیگا۔ اور ضروری نہیں کہ تمام عمر آپ ایمان کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہونگے۔ نہیں... زندگی میں نشیب و فراز آئیں گے۔ کبھی آپ اللہ کے زیادہ قریب ہونگے کبھی کم۔ لیکن جب تک آپ کے پاس روشنی کا ایک بھی ذرہ ہے۔ امید کی کرن باقی ہے۔ آپ اسے زیادہ روشن کر سکتے ہیں۔ دوبارہ سے اٹھ کر۔ پھر سے اپنے اللہ کی طرف لوٹ کر۔ آپ اس کی طرف ایک قدم بڑھائیں گے۔ وہ دس بڑھائے گا۔ بس اللہ سے تعلق کو کبھی ختم نہیں کرنا۔ اس کی محبت پر کبھی شک نہیں کرنا۔ اس سے دستبردار نہیں ہونا۔ جب تک سانس باقی ہے، آپ نے کوشش جاری رکھنی ہے۔"

آحل دم بخود سا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ دو تین اور بھی معزز لوگ آکر بیان دیتے رہے۔ سیمینار کب ختم ہوا، اسے اندازہ ہی نہیں ہو

پایا تھا۔ وہ تو عبد اللہ بن مسعود کی باتوں میں کھو گیا تھا۔ ایسی باتیں وہ اکثر سنتا تھا لیکن جو نرمی اور خوبصورتی ان کے لہجے میں تھی، وہ مسحور ہو گیا تھا۔ وہ نمازیں بھی پڑھتا تھا، جس حد تک اس سے ہو سکتا تھا، گناہوں سے بچنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ لیکن اللہ سے کبھی دل کا تعلق نہیں بن پایا تھا۔

شاید اس نے کبھی کوشش نہیں کی تھی اسے جاننے کی، یا پھر کسی نے اس کا اتنا خوبصورت تعارف کروایا ہی نہیں تھا۔ لیکن آج اس ہال سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں عبد اللہ بن مسعود کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کی باتیں سنتا رہے۔ اللہ کو مزید جاننے کی کوشش کرے۔

اس کے بعد اس نے حسن کے ساتھ ان کے ہر سمینار میں جانا شروع کر دیا۔ وہ دن بہ دن اللہ کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور زندگی میں ایسا سکون اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا جو اس عرصے میں اس کے روح میں اتر گیا تھا۔ یونی ورسٹی سے چھٹی کے دن وہ ان کے گھر درس پر جاتا تھا اور شام کو مال میں ہوتا تھا جہاں اکثر کومل اس سے ملنے آجاتی تھی۔ عبد اللہ بن مسعود کی باتوں کا کچھ اثر تھا کہ اب وہ کومل سے تھوڑا دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ اس سے کسی گوند کی طرح چپکی رہتی تھی۔ ایک دن وہ شاپ میں کھڑا کسی لڑکی کو جوتے دکھا رہا تھا کہ وہ اس کے سر پر پہنچی۔

"آحل چلو میرے ساتھ۔ کہیں چل کر اچھا سا ڈنر کرتے ہیں۔"

"تھوڑا ویٹ کرو۔ میں پانچ منٹ تک آتا ہوں۔" وہ مصروف سے انداز میں بولا۔

"پلیز آحل یہ جاب چھوڑ دو تم۔ مجھے بہت ذہر لگتے ہو اس حلیے میں۔" آحل اسے اگنور کئے اپنا کام کرتا رہا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھی۔

"تمہاری نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے آحل۔ تم نا ہمیشہ ان لڑکیوں کے پاؤں میں جوتے پہناتے رہو گے۔" وہ نخوت سے بولی تو آحل کی آنکھوں میں ایک دم ناگواری سی اتر آئی۔ ہاتھ سے پکڑ کو وہ اسے باہر لایا اور مال کے باہر ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا۔

"مس کومل!! میری سیلف رسپیکٹ اتنی کم نہیں کہ لوگوں کو جوتے پہناتا پھروں۔" وہ دبے دبے غصے میں بولا۔ "ہاں جوتے بیچ ضرور سکتا ہوں۔ حق حلال کی کمائی کرنے میں مجھے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ میرے باپ نے مجھے اپنی محنت پر سر اٹھا کر جینا سکھایا ہے۔

اور اگر تمہیں میری یہ جاب نہیں پسند تو جاؤ یہاں سے۔ کیوں کھڑی ہو یہاں۔ کیوں میرے پیچھے آجاتی ہو ہر روز؟" اسے واقعی غصہ آنے لگا تھا۔

"آحل۔ ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟ میں تو صرف... مجھے بس تمہاری یہ جاب پسند نہیں۔" وہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی تو وہ تھوڑا دھیما ہوا۔

"جب تک مجھے کوئی اچھی جاب نہیں مل جاتی، میری پڑھائی کمپلیٹ نہیں ہو جاتی، میں یہ جاب نہیں چھوڑ سکتا۔ تم اچھے سے جانتی ہو۔"

"اوکے۔ نہ چھوڑو۔ لیکن مجھ پر ایسے غصہ نہیں ہوا کرو۔" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرائی۔ "چلو کچھ اچھا سا کھاتے ہیں۔"

عجیب سی لڑکی تھی وہ۔ دو پل میں اس کا موڈ نارمل ہو جاتا تھا۔ شاید وہ محبت کی وجہ سے نارمل رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ یا پھر شاید اسے اپنی سیلف رسپیکٹ زیادہ عزیز نہیں تھی۔ کبھی کبھی آحل کو اس سے کوفت سی محسوس ہونے لگتی۔ لیکن وہ اسے پسند کرتا تھا، پھر اچھائی اور برائی تو ہر انسان میں ہوتی ہے۔ وہ بس اس کی ایسی حرکتیں اگنور کرنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وقت کے ساتھ کومل میچیور ہو جائے گی۔

اس کا آخری سمسٹر تھا جب وہ عبداللہ بن مسعود کے گھر ان سے ملنے آیا تھا۔ حسن نے ان سے آحل کا تعارف بھی کروا دیا تھا۔ وہ نیک ہونے کے ساتھ ایک اچھے ناصح بھی تھے۔ اکثر وہ اپنے مسائل ان سے بیان کرتا تھا۔ اور وہ ایک اچھے دوست کی طرح ان کے حل بتایا کرتے۔

"عبداللہ صاحب، میں کافی دنوں سے آپ سے ایک بات کرنا چاہ رہا ہوں لیکن ہمت نہیں ہو پا رہی۔ میں ایک لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا لیکن..."

"کس نے کہا برخوردار کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا؟" وہ ہونق سا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ "پسندیدگی پر کسی کا اختیار نہیں۔ اگر تم کسی کو پسند کرتے ہو، اس سے نکاح کر لو۔ ہاں اس سے پہلے تعلق رکھنا حرام ہے۔"

"کیا میں اس سے نکاح کر لوں؟"

"بلکل۔ اگر وہ راضی ہے۔ گھر والے راضی ہیں تو بسم اللہ کرو۔ اس سے زیادہ خوبصورت بات کیا ہو سکتی ہے؟"

"لیکن ابھی میں کچھ خاص کماتا نہیں ہوں اور..."

"یہ سب محض بہانے ہیں۔ اگر تم واقعی اسے پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کرنے میں تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔"

"ایسا نہیں ہے۔ میں واقعی اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں آج ہی اپنے بابا سے بات کروں گا۔" وہ آگے سے مسکرائے اور اس کے کندھوں کو تھپکا۔

رات کو اس نے بابا کو کال کر کے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اس کی بات سے خوش ہوئے تھے۔ وہ خود اس کی زندگی میں خوشیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ اب صرف کومل سے بات کرنی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ کومل کو اور اس کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ وہ کچھ دنوں سے اسے بہت عجیب لگ رہی تھی۔ اس کی بات کا ٹھیک سے جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ شاید یہ بھی آحل کے اگنور کرنے کا نتیجہ تھا۔ ورنہ وہ تو اس سے دور رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ شادی کا سن کر وہ بلکل نارمل ہو جائے گی۔ یہ سب سوچ کر وہ بہت خوش تھا۔ اسے اب احساس ہونے لگا تھا کہ زندگی کی تمام تکالیف ختم ہونے لگی تھیں۔ اس کی زندگی میں بے تحاشہ خوشیاں آنے والی تھیں۔

لیکن یہ خوشیاں کب تک رہنی تھیں، کوئی نہیں جانتا تھا۔ قسمت دور کھڑی اس پر ہنسی تھی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

اگلے دن اس نے کومل کو ایک ریسٹوارانٹ میں ملنے کے لیے بلایا۔ وہ اچھے سے تیار ہو کر، پھولوں کا بکے لیے وہاں پہنچا تھا۔ کومل پہلے سے اس کی بک کردہ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا کر قدم قدم اس تک چلتا آیا۔

"گڈ ایوننگ!" اس نے بوکے ٹیبل پر رکھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

"کیا بات کرنی تھی آحل؟ مجھے کہیں جانا تھا، کیا ہم جلدی بات کر سکتے ہیں؟" جانے کیوں وہ آج عجیب سی لگ رہی تھی۔

"مجھے بہت اہم بات کرنی ہے۔ جس کا تمہیں اتنے وقت سے انتظار ہے کومل۔" وہ مسکرا کر بولا تو وہ نا سمجھی میں اسے دیکھنے لگی۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟" وہ کچھ پل اس کا جواب سننے کو رکا۔ "دیکھو میں بابا سے بات کر چکا ہوں اس بارے میں۔ وہ بہت خوش ہیں ہمیں لے کر، اور میں جانتا ہوں تمہیں اور تمہاری فیملی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن میں جلد ہی تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس ناجائز رشتے میں اور نہیں رہنا چاہتا۔"

"تو ختم کر دو اس رشتے کو۔ روکا کس نے ہے؟" وہ خشک سے لہجے میں بولی۔

"ایکسکیوز می؟"

"میں بلکل صاف بات کرونگی آحل۔ میں تم سے کوئی شادی وادی نہیں کرنے والی۔ نہ آج، نہ آئندہ کبھی۔ وی کین بی گڈ فرینڈز لیکن اس خیال کو تم دل سے نکال دو۔" دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھے وہ ایک ہی سانس میں کہتے ہوئے اسے حیران کر گئی۔

"کہنا کیا چاہتی ہو تم؟ کیا مطلب کہ شادی نہیں کرو گی؟ اب تک ہمارے درمیان کوئی مزاق چل رہا تھا کیا؟ یا تم صرف ٹائم پاس کر رہی تھی میرے ساتھ ہاں؟" اسے غصہ آنے لگا۔

"چلاؤ مت آحل۔ یہ تمہارے باپ کی جگہ نہیں ہے۔ خیر تمہارے باپ کی تو کوئی جگہ ہے بھی نہیں۔" وہ سر جھٹک کر ہنسی۔ "جسٹ لیو اٹ۔ میں بلکل بھی تمہارے ساتھ کوئی ٹائم پاس نہیں کر رہی تھی آحل اسفندیار۔ لیکن تم نے یہ فیصلہ لینے پر مجھے مجبور کر دیا ہے۔ تم نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں اپنی محبت سے دستبردار ہو جاؤں۔ تم جانتے ہو میں نے تم سے کتنی محبت کی لیکن اب میں تمہارے ہاتھوں مزید اسپائل نہیں ہونا چاہتی۔" وہ ہونق سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی اور کیوں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"تم جیسے لڑکے سے شادی کرنے سے اچھا ہے کہ میں کسی یتیم خانے میں رہ لوں۔ تمہارے پاس ہے ہی کیا مجھے دینے کے لیے؟

صرف ایک اچھی شکل اور دل؟ اس کا مجھے کیا کرنا ہے؟ زندگی اس کے سہارے نہیں گزاری جا سکتی۔ میں نے کتنی دفعہ تمہیں کہا کہ کوئی اچھی جاب ڈھونڈو، کچھ کرو۔ لیکن تم تو ایک سیلز مین ہو۔ اور تمہیں بہت فخر ہے اس بات پر۔" آحل کو لگا وہ کچھ سال پہلے چلا گیا ہے۔ جہاں اس کے باپ کو ایک عورت ایسے ہی کچھ الفاظ سنا کر دو کوڑی کا کر گئی تھی۔ اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اسے اتنی جلدی ہائپر نہیں ہونا تھا۔ شاید اس کے والدین راضی نہ ہوں اس رشتے کے لیے، اس لیے وہ ری ایکٹ کر رہی ہو۔

"کیا آنٹی نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔ انہوں نے کیا کہنا ہے۔ یہ میری زندگی ہے آحل۔ میں اسے اپنے طریقے سے جینا چاہتی ہوں۔ اور تمہارے ساتھ میں یہ غریبوں والی زندگی کبھی نہیں گزار سکتی۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں نا کومل۔ ڈگری کمپلیٹ ہونے والی ہے۔ ان شاء اللہ اچھی جاب بھی مل جائے گی۔ ہم شادی کے بعد مل کر بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔" وہ اتنی جلدی ہار کیسے مان لیتا؟ تین سال ایک رشتہ رکھنے کے بعد ایسے کیسے ایک دم سے جانے دے دیتا؟ رشتے اتنی جلدی تو ختم نہیں ہوا کرتے۔ اسے اندر سے اب بھی امید تھی کہ شاید وہ کوئی مزاق کر رہی ہو۔ لیکن دماغ کچوکے لگا رہا تھا کہ جو وہ کہہ رہی تھی، وہی سچ تھا۔

"آحل دیکھو۔ میرے لیے ویسے بھی ایک پروپوزل آیا ہوا ہے۔ ماما لوگ اس پر غور کر رہے ہیں۔ وہ ہمارے سٹینڈرڈ کا لڑکا ہے۔ بہت امیر ہے۔ میری اس سے بہت اچھی بن جائے گی۔ اور مائنڈ مت کرنا لیکن تم اگر دس دفعہ بھی مر کر زندہ ہو جاؤ تو اس جتنا پیسا نہیں کما پاؤ گے۔ سچ۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ تم اپنے لیے کوئی اپنے جیسی غریب سی لڑکی دیکھ لو اور اس سے شادی کر لو۔" وہ اچھے دوستوں کی طرح مشورہ دیتے ہوئے بولی۔ "وہ یقیناً تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔" آحل کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

"اپنے گھٹیا مشورے اپنے پاس رکھو۔" ٹیبل پر پڑے ان پھولوں کو جھٹک کر اس نے پرے پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "یو..." اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ کر منہ پر رکھیں۔ اس کا تنفس بہت تیز ہو گیا تھا۔ وہ ضبط کے آخری مرحلے پر تھا لیکن غصے میں کچھ غلط بولنے سے خود کو روک رہا تھا۔

"انجوائے یور چیپ رِچ لائف وومن!!" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ سرد انداز میں بولا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا۔ باہر آکر اس نے کھلی فضا میں دو تین بار سانس خارج کی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کے کانوں نے جو سنا تھا وہ سچ تھا۔ اور یہ سب کہا بھی کس نے؟ اس لڑکی نے جو جانے کہاں سے آکر اس کی زندگی میں چپک گئی تھی۔ اتنی بے عزتی؟ اتنی ازیت؟ اوہ اللہ!

اس کا سر نہایت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بلاک میں، اپنے روم تک کیسے پہنچا وہ نہیں جانتا تھا۔ بس جاتے ہی اس نے کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں تو اندر سے آنسو ابل ابل کر نکلنے لگے۔ وہ مرد تھا لیکن انسان تھا۔ اور اس کے ضبط اور مردانگی کی انتہا تو یہ تھی کہ کومل جیسی گھٹیا لڑکی کو کچھ برا بھلا کہے بغیر وہ وہاں سے چلا آیا۔

اب وہی ضبط ٹوٹ کر آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔ صد شکر کہ اس وقت باقی تینوں میں سے کوئی کمرے میں نہیں تھا۔ ان تینوں کے آنے تک وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ لیکن اگلے ہی دن اسے سخت بخار ہو گیا تھا۔ کچھ دن وہ اسی طرح بخار میں پھنکتا رہا۔ حمزہ نے کافی دفعہ اس سے ایسی حالت کی وجہ بھی پوچھی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔

"اتنا سب کچھ ہو گیا اور تو نے مجھے کچھ نہیں بتایا؟" اگلے دن حمزہ اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

"کیا ہو گیا ہے؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ انجان بننے لگا تو حمزہ نے ایک گھوری سے نوازا۔

"میری بات ہوئی تھی کومل سے۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم دونوں کے درمیان کچھ غلط ہوا ہے۔ کافی وقت سے وہ تمہیں اگنور کر رہی تھی آحل۔ لیکن اس طرح تمہاری طبیعت خراب ہونا کوئی نارمل بات نہیں تھی۔ کومل نے مجھے بتایا کہ تم دونوں کا بریک اپ ہو چکا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ یا شاید جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آحل نے نظریں پھیریں۔

"ہوں۔"

"وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" اور پھر آحل نے اسے شروع سے ساری بات بتائی۔

"دکھ یہ نہیں ہے کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ ہر دوسرے انسان کا بریک اپ ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت بعد انسان نارمل بھی ہو جاتا ہے اور

زندگی میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس نے جس وجہ سے مجھے چھوڑا ہے نا حمزہ۔ وہ شاید میرے دل کو اندر سے چیر گئی ہے۔" وہ سرد مسکراہٹ لیے کہہ رہا تھا۔ "میرے باپ کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ تب مجھے لگا کہ اس دنیا کی عورتوں کو صرف دولت میں دلچسپی ہے۔ اسی وجہ سے میں نے کسی عورت کو اپنی زندگی میں نہیں آنے دیا۔ لیکن کومل... وہ آہستہ آہستہ میری زندگی کا حصہ کیسے بن گئی، مجھے اندازہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد مجھے ایسا لگنے لگا کہ عورت ذات کے بارے میں میری سوچ غلط تھی۔ عورت تو بہت معصوم ہوتی ہے۔ میں اسے صرف پسند کرتا تھا، محبت تھی یا نہیں، ابھی تو یہ فیصلہ ہوا بھی نہیں تھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی میں سکون چاہتا تھا۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا۔ لیکن..." اس نے گہرا سانس لیا اور پھر اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "عورت ذات نہ محبت کے لائق ہوتی ہے، نہ بھروسے کے قابل۔ تمہیں لگتا ہے اب میں پوری زندگی کسی عورت پر بھروسہ کر پاؤں گا؟" وہ سرخ آنکھیں لیے اسے دیکھ کر بولا۔

"آحل خاناں۔ میرے یار۔ میرے بھائی۔" حمزہ اس پر ترس کھاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے گلے لگا۔

"پرے ہٹو یار۔ اتنا نازک نہیں ہوں کہ رونے بیٹھ جاؤں۔" اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس نے اپنا کندھا جھاڑا۔

"کل تک شاید میری طبیعت خراب تھی۔ ہے نا؟"

"وہ تو موسم کی وجہ سے خراب تھی۔" اس نے جان چھڑانے کی کوشش کی تو حمزہ نے برا سا منہ بنا کر اس کی نقل اتاری۔

ایگزامز میں ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ وہ ایک مہینہ اس نے پڑھائی میں خود کو مصروف رکھ کر کسی نہ کسی طرح گزار لیا۔ اس سب عرصے میں حمزہ نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ آحل کہیں بھی اکیلا نہ ہو، اسے زیادہ سوچنے کا وقت نہیں دیتا تھا۔

اور پھر وہ رزلٹ تک وہیں رکا رہا۔ حمزہ اسے اپنے گھر ساتھ لے گیا۔ قریباً دو ہفتے وہ وہیں رہا تھا۔ تب عائشہ بھابھی کی بڑی بیٹی، مہرماہ قریباً کوئی ڈھائی تین سال کی تھی، وہ اس کی گود میں آکر بیٹھ جاتی۔ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی تھی۔ آحل کی اس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ جس دن انڈونیشیا واپس گیا۔ مہرماہ اس کے پیچھے گھنٹوں روتی رہی۔ لیکن اسے تو جانا ہی تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اس ملک نے اتنا گہرا زخم دیا تھا کہ وہاں دوبارہ جانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ جہاز میں بیٹھا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں اپنی بائیس سالہ زندگی گھوم رہی تھی۔ ان بائیس سالوں میں اس نے صرف کچھ سال کھل کر زندگی کو جیا تھا۔ اور پھر ایک جھٹکے سے سب کچھ ختم ہو گیا۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

قریب کسی مسجد سے آذان کی آواز آ رہی تھی۔ شروع میں تو اسے سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر ذہن پر زور ڈالا، نظریں ادھر ادھر دوڑائیں تو احساس ہوا کہ وہ کہاں بیٹھی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ اپنی دنیا میں واپس آئی۔ ایک نظر ہاتھ میں پکڑی اس ڈائری کو دیکھا۔ پھر ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں آئے پانی کو صاف کیا۔ وہ یک دم ٹھٹک گئی۔ وہ رو رہی تھی؟ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ آحل کی زندگی میں ایسی گم ہو گئی تھی کہ اسے اپنا ہوش ہی نہ رہا۔ اور اس کے دکھ اور تکالیف کو پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے جانے کب پانی بہنے لگا تھا۔

اس نے پٹ سے ڈائری بند کی اور اس ڈبے میں واپس رکھی۔ اسے دراز میں رکھ کر وہ مڑی اور گھڑی دیکھی تو وہیں سن رہ گئی۔ گھڑی

شام کے وقت کا پتہ دے رہی تھی۔ اسے تو لگا کہ یہ عصر کی آذان ہو رہی تھی۔ مگر عصر کب کی گزر چکی تھی۔ مغرب چھا گئی تھی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اس کی نماز عصر قضا ہو چکی تھی اور اسے احساس تک نہیں ہوا۔ کیسی غفلت میں ڈال دیتی ہے یہ دنیا کہ انسان کو خدا تک یاد نہیں رہتا۔

استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ یا اللہ معاف کر دینا پلیز۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی واشروم کی طرف بھاگی۔ جلدی سے وضو کر کے باہر نکلی۔ جائے نماز بچھا کر عصر کی قضا پڑھی۔ پھر مغرب پڑھ کر اللہ سے معافی مانگنے لگی۔

'یا اللہ پلیز پلیز معاف کر دینا۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔ بس ابھی معاف کر دینا۔' جائے نماز پر وہ ہاتھ جوڑ کر بیٹھی تھی کہ اچانک اسے کومل کا خیال آیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری اتری۔ اس کے نام سے ہی اسے عجیب سی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ دل کیا کہ وہ کہیں سے مل جائے اور اس کا چہرہ نوچ آئے۔

'استغفر اللہ۔ نہیں نہیں میں کسی سے نفرت نہیں کرتی یا اللہ۔ یہ شیطان مجھے بہکا رہا ہے۔' اور پھر کافی دیر تک وہ جائے نماز پر بیٹھی اللہ سے باتیں کرتی رہی۔ معافی مانگتی رہی۔ اسے مناتی رہی۔ آحل کے مسائل بیان کرتی رہی۔

اتنے عرصے میں وہ آحل کو سمجھ نہیں پائی تھی لیکن اب اس کی دھندلی شخصیت کچھ واضح ہونے لگی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ شاید منگنی کے بعد اس کے بات نہ کرنے کی وجہ سے آحل کا یہ رویہ تھا۔ مگر اسے اب اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اب تک نارمل کیوں نہیں ہو پایا تھا۔ نہ ان کے رشتے کے بارے میں کوئی بات کرتا تھا۔ اس کی زندگی میں اتنا سب گزر چکا تھا، اب محض چند مہینوں میں اس پر بھروسہ کرتا بھی تو کیسے؟ اور اس نے خود کونسا کوئی کوشش کی تھی اس کا بھروسہ جیتنے کی۔ اسے تو خود ہزار گلے تھے آحل سے۔

لیکن اس سب میں ایک بات بہت واضح تھی کہ ہائمہ یوسفزئی کے دل میں آحل کے لیے ایک نرم گوشہ بننے لگا تھا۔ اسے شاید خود بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا لیکن آسمان پر چھائے کالے بادل شام کا سماں بنائے ہوئے تھے۔ وہ گھر کا مین گیٹ کھول کر اندر آیا۔ لونگ روم کا دروازہ بند تھا۔ وہ قدم قدم چلتا آیا اور اسے کھول کر اندر داخل ہوا۔ شوز اتار کر اس نے ریک میں رکھے اور شرٹ کے آستین فولڈ کرتا کچن کی طرف آیا۔ وہاں سے پانی کے بہنے کی ہلکی سی آواز آرہی تھی۔

"پلیز کھانا لگا دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔" دروازے کے ساتھ پڑے فریج کا دروازہ کھول کر اس نے اندر سے پانی کی بوتل نکالی۔ پھر ایک نظر پیچھے دیکھا۔ وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ سِنک کے اوپر لگی ٹونٹی میں سے بوندوں کی صورت پانی ٹپک ٹپک کر وہاں چھائی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا، پانی کے چند گھونٹ پی کر بوتل واپس رکھی اور پھر جا کر ٹونٹی کو بند کیا۔

"کتنی دفعہ کہا ہے ٹونٹی فل بند کیا کرو۔" وہ ہلکا سا بڑبڑایا۔

کچن سے نکل کر وہ اس کے کمرے تک آیا۔ اس نے پورے کمرے میں نظر دوڑائی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ واش روم کا دروازہ کھول

کر دیکھا۔ وہ بھی خالی تھا۔ وہ شاید اوپر ہو گی۔

"ہائمہ... کہاں ہو ہائمہ؟" اسے آوازیں دیتا وہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا۔ پہلے ایک کمرہ دیکھا۔ اور پھر دوسرا۔ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ تیسری منزل کی چھت پر گیا۔ لیکن وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ اس نے پورا گھر دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔

پھر موبائل نکال کر اس کا نمبر ملایا۔ وہ بند جا رہا تھا۔ شاید نور فیاہ کے ساتھ کہیں گئی ہو گی۔ خیر، وہ آرام سے لونگ روم میں پڑے صوفے پر نیم دراز ہوا اور ٹی وی آن کر کے دیکھنے لگا۔ قریباً پندرہ منٹ ایسے ہی گزرے گئے۔ اسے شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔

اسے خیال آیا کہ نور فیاہ کو فون کر کے پوچھ لینا چاہیئے۔ اس کا نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔

"نور فیاہ... ہائمہ کو فون دینا پلیز۔"

"ہائمہ کو؟ کہاں ہے ہائمہ؟" دوسری طرف سے نور فیاہ کی حیرت بھری آواز ابھری۔

"کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے؟"

"نہیں۔ میں تو کسی کے گھر آئی ہوں۔ خیریت؟ کہاں ہے ہائمہ؟"

"پتا نہیں۔ گھر میں تو نہیں ہے۔ مجھے لگا تمہارے ساتھ ہو گی۔ خیر، میں اسے پارک میں دیکھ لیتا ہوں۔ تمہارا شکریہ۔" مسکرا کر اس نے کال کاٹ دی۔ اور پھر فون صوفے پر اچھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹی وی بند کر کے وہ باہر آیا۔ گھر کے قریب ایک پارک تھا، وہ اکثر وہاں واک کرنے جاتی تھی۔ شاید ادھر ہی ہو گی۔

پارک میں پہنچ کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی اکا دکا لوگ تھے۔ لیکن ہائمہ کہیں نظر نہیں آئی۔ اسے تشویش ہونے لگی تھی۔ آخر کہاں چلی گئی تھی اس وقت۔ اس طرح بنا بتائے تو وہ کہیں نہیں جاتی تھی۔ اور پھر اس کا فون بھی بند جا رہا تھا۔ وہ گھر واپس آ کر دوبارہ سے اس کا نمبر ملانے لگا۔ لیکن جواب ندارد۔

قریباً گھنٹہ ہونے کو تھا اور ہائمہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اب اسے واقعی پریشانی ہونے لگی تھی۔ اس شہر میں نور فیاہ کے علاوہ اس کی کسی

کے ساتھ خاص دوستی بھی نہیں تھی۔ نہ اسے یہاں کی زبان آتی تھی کہ کہیں اکیلی نکل پڑتی۔ جائے گی بھی تو کہاں؟

وہ آگے پیچھے چکر کاٹتا سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ایک دم ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔

'سنا ہے تمہاری بیوی بھی آئی ہوئی ہے تمہارے ساتھ!' کسی کی مانوس سی آواز اس کے ذہن میں گونجی۔ وہ شیطانی مسکراہٹ والا چہرہ!!

اوہ اللہ!! اس کا دماغ جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جانے اسے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔

لیکن اب اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اسے جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔ چابی اٹھا کر بھاگتا ہوا وہ گھر سے نکلا۔ مین گیٹ کے پاس جا کر اس کے دماغ میں کچھ کھٹکا۔ دروازہ کس نے بند کیا تھا؟ خیر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا اس کے پاس۔ اسے جلد از جلد اس شخص تک پہنچنا تھا۔ اسے ہائمہ کو ڈھونڈنا تھا۔ جانے وہ کس حالت میں ہو گی۔ وہ کچھ برا سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

فون پر احمد کا نمبر ملاتا وہ ٹیکسی ڈھونڈنے لگا۔ لیکن موسم کی خرابی کے باعث آج بہت کم ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں۔

"احمد۔ مجھے یودا کا ٹھکانہ بتاؤ۔ وہ آج کل کہاں ہے، مجھے جلد از جلد اس کی ساری انفارمیشن چاہیئے۔" وہ ایک ہی سانس میں بولا تھا۔

"کیا ہوا آحل؟ اتنی جلدی میں کیوں ہو؟" وہ آرام دہ انداز میں بولا۔

"میرے پاس ابھی وقت نہیں ہے احمد۔ پلیز مجھے اس کا ٹھکانہ بتاؤ۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا اور کال کاٹ دی۔ اسے اپنی آنکھیں جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جانے وہ خبیث انسان ہائمہ کو کہاں لے گیا ہو۔ اس کے ساتھ کیا... اس سے آگے اسے اپنا دماغ بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں احمد اپنی گاڑی لا کر اس کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔

"کیا ہوا ہے آحل؟ تم بہت ٹینشن میں لگ رہے ہو۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"ہائمہ نہیں مل رہی۔ اور مجھے یودا پر شک ہے۔ اس نے کچھ..."

"ایسے کیسے کہہ سکتے ہو تم۔ مانا کہ وہ برا ہے لیکن یہ گھر والی بات اتنی بڑی بھی نہیں کہ وہ تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالے گا۔" آحل نے ایک بے یقینی والی نظر اس پر ڈالی۔ پھر اپنی اور یودا کی ملاقات کا بتایا تو وہ اس کی باتوں پر دنگ رہ گیا۔

"یہ تو واقعی تشویش والی بات ہے آحل۔ وہ بھابھی کے ساتھ کچھ غلط بھی کر سکتا ہے۔ تم جانتے ہو اس کا باپ کیسے دھندوں میں..." آحل کی انگارہ برستی آنکھوں کو دیکھ کر اس نے لب بھینچ لیے۔ "ٹینشن نہیں لو۔ بھابھی خیریت سے ہونگی ان شاءاللہ۔" اسے دلاسہ دیتے ہوئے احمد نے گاڑی میں بٹھایا۔

"استقلال مسجد کی پچھلی طرف ایک نئی آبادی بنی ہے۔ یودا اور اس کا باپ آج کل وہیں رہائش پزیر ہیں۔ اس ایلیٹ کلاس کالونی میں گھر لے کر انہوں نے بہت لمبا ہاتھ مارا ہے۔ لیکن دولت کی ہوس اتنی کہ تمہارے گھر کے پیچھے بھی پڑے ہیں۔ خیر، وہاں چل کر دیکھتے ہیں، امید ہے وہیں ہو گا وہ خبیث انسان۔" آحل نے سمجھ کر سر ہلایا اور پھر ایک لمبی سانس خارج کی۔

"یہ ارشاد اظہری اتنا امیر کب سے ہو گیا کہ اتنی اچھی جگہ گھر لے سکے؟"

"غلط کام انسان کو دنوں میں امیر بنا دیتے ہیں۔" ایک سڑک پر موڑ کاٹتا ہوا وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ایسی امارت پہ لعنت!"

"غصے میں لگ رہے ہو۔" وہ اس کا موڈ بہتر کرنے کے لیے چڑا رہا تھا۔

"کیا نہیں ہونا چاہیئے؟"

"ریلیکس۔ مل جائے گی بھابھی۔"

تھوڑی دیر تک وہ لوگ یودا کے اس نئے گھر کے آگے موجود تھے۔ احمد اتر کر گھر کے اندر گیا۔ وہ وہیں گاڑی میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پانچ منٹ بعد ہی احمد گھر سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔

"گھر پر کوئی نہیں ہے سوائے ملازموں کے۔ ایک ملازم کو ٹپ دے کر پوچھا ہے۔ وہ کسی ریسٹورانٹ کا بتا رہا تھا۔ دعا کرو اب وہاں مل جائے۔"

"آمین ثم آمین!!"

وہ لوگ ملازم کے بتائے ہوئے اس ریسٹورانٹ میں آئے۔ ریسٹورانٹ کے باہر گاڑی کھڑی کر کے نکلنے ہی لگے تھے کہ سامنے اس کی نظر پڑی۔ یودا اظہری ایک لڑکی کے ساتھ ہنستا ہوا چلتا آ رہا تھا۔ وہ ہشاش بشاش چہرہ لیے اس چھوٹی لڑکی کی باتوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی آحل کے ماتھے کی رگیں تن گئی تھیں۔ اتنے وقت سے اس کا ضبط کیا ہوا غصہ اب لاوے کی طرح پھٹنے کو بے تاب تھا۔ اس نے قدم بڑھانے چاہے لیکن احمد نے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

"آرام سے بات کرنا۔" اس نے ایک گہری نظر احمد پر ڈالی اور اثبات میں سر ہلاتا ہوا یودا کی طرف آیا۔ احمد بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"اوہ ہائے۔ واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز پاک (مسٹر) آحل!" اس پر نظر پڑتے ہی یودا نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ "یہ میرا دوست ہے ایشا۔ اور یہ میری گرل فرینڈ، ایشا انداہ سری۔" وہ اپنی ساتھ کھڑی لڑکی کا تعارف کروا رہا تھا۔ ایشا کا آحل کو دیکھ کر رنگ نچڑ گیا تھا۔ وہ اس کے باپ کو بتا سکتا تھا ان کے بارے میں۔ لیکن آحل نے تو اس کو دیکھا تک نہیں۔ وہ یودا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

"میری بیوی کہاں ہے؟" وہ آگے بڑھ کر دانت رگڑتے ہوئے بولا تو یودا کی بھنویں اکٹھی ہوئیں۔

"کونسی بیوی؟ کس کی بیوی؟" اور بس پھر کیا تھا۔ آحل اسفندیار کا ضبط ختم ہوا۔ اور ایک زبردست مُکا یودا کے گال پر پڑا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ ایشا ڈر کر پیچھے ہوئی۔ احمد نے آگے ہو کر آحل کو کندھوں سے پکڑا تو اس نے اسے جھٹکا۔

"چھوڑو مجھے۔ آج میں اسے بتاتا ہوں کہ میری بیوی کون ہے۔ اور اس نے کس کی عزت پر اپنا ہاتھ ڈالا ہے۔ غلیظ انسان میری بیوی پر

کب سے نظر رکھی ہوئی تھی تم نے ہاں؟" آگے آکر اس نے اس کے کندھے پر زور کا جھانپڑ رسید کیا۔ "مجھے کہتا ہے کون سی بیوی؟" دو اور مُکے لگنے کے بعد وہ زمین پر گر پڑا تھا۔

"کام ڈاؤن آحل۔ تماشہ مت بناؤ۔ لوگ دیکھ رہے ہیں، منہ سے بھی بات ہو سکتی ہے۔" احمد اسے پیچھے کرتے ہوئے بول رہا تھا۔

"دیکھنے دو لوگوں کو۔ انہیں بھی تو پتا چلے یہ کیسا انسان ہے۔ بلکہ سب سے پہلے تو اس کی اس گرل فرینڈ کو پتا چلنا چاہیئے۔" وہ ایشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جو یودا کو اٹھانے میں مدد کر رہی تھی۔ "جانتی ہو یہ کیسا انسان ہے؟ جس کے لیے تم اپنے باپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ میرا گھر ہتھیانے کے چکر میں اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ لیکن تم کیا سمجھے میں تمہیں ایسے ہی جانے دونگا۔ بتاؤ میری بیوی کہاں ہے۔ بتاؤ کہاں ہے ہائمہ؟" وہ اب آگے بڑھا تو یودا نے ایک پنچ اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ بس پھر ان دونوں کی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

"میں نے قسم کھائی تھی یودا اظہری کہ اگر تم نے میری بیوی پر اپنی گندی نظر ڈالی تو میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دونگا۔ اور آحل اسفندیار قسمیں نہیں توڑا کرتا۔" وہ اتنے غصے میں تھا کہ اگر احمد اسے نہ روکتا تو وہ واقعی اس کی آنکھیں نکال چکا ہوتا۔

"مجھے تمہاری بیوی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارے گھر میں دلچسپی تھی، اور اس دن تو میں نے صرف ایک دھمکی دی تھی تمہیں۔ اور تم ڈر گئے مجھ سے۔ کیا تم اتنے ڈرپوک ہو؟ چچ چچ۔" وہ طنز کرنے لگا۔ "اپنی بیوی سنبھالی نہیں جاتی۔ آجاتے ہو لوگوں سے پوچھنے۔ کیا پتا وہ تم سے اتنی تنگ ہو کہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ تمہیں پسند ہی نہیں کرتی ہو گی۔ بھاگ گئی ہو گی اپنے کسی عاشق کے ساتھ۔" آسمان سے بادلوں کے گرجنے کی آواز آئی۔ ساتھ میں بجلی بھی کڑکی تھی۔ موسم کے تیور آج الگ ہی تھے۔

"غلیظ انسان۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بیوی کے بارے میں ایسی بات کرنے کی۔ تمہیں میں آج چھوڑوں گا نہیں۔" اور پھر اس نے مکوں اور لاتوں سے اس کا اتنا برا حشر کر دیا تھا کہ اس کے چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے۔ منہ سے خون نکل رہا تھا۔ اور وہ خباثت لیے ہنس رہا تھا۔ اس کی جوابی کاروائی میں آحل کے ماتھے پر گہری چوٹ لگی تھی۔ جس سے خون رسنے لگا تھا۔ لیکن اسے اپنا ہوش کب تھا۔ آس پاس لوگ جمع ہو گئے تھے۔ تماشہ سا لگ گیا تھا وہاں۔

"آحل چلو یہاں سے۔ آحل۔" احمد اسکا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ "خود پر قابو رکھو۔ ایسی جگہ پر دو منٹ میں پولیس آسکتی ہے۔" اسے ایک طرف کرتے ہوئے وہ سرگوشی میں اسے سمجھانے لگا۔

"مجھے کسی کا بھی ڈر نہیں ہے۔ آجائے پولیس لیکن آج میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے میری بیوی کے بارے میں ایسی بات سوچی بھی کیسے؟"

"اس نے نہیں چھپایا ہائمہ کو۔ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ سن رہے ہو؟" وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے بولا جو یودا کو شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "وہ کہیں اور ہو گی، مل جائے گی اگر ہم ڈھونڈیں۔ لیکن تم ادھر اس کے ساتھ لگے رہو گے تو اسے کیسے ڈھونڈو گے؟ اسے مار مار کر کیا تم جیل پہنچنا چاہتے ہو؟ اس کے بعد کون ڈھونڈے گا بھابھی کو ہاں؟" اس کی بات پر آحل نے نظر موڑ کر دیکھا تو احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہمیں بھابھی کو ڈھونڈنا ہے۔ وہ زیادہ اہم ہیں اس وقت۔"

"تمہیں تو میں بعد میں دیکھ لونگا۔" وہ یودا کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکارا اور پھر احمد کے ساتھ گاڑی کی طرف چلا آیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے لمبی سانس خارج کی۔

"گھر چلو۔" احمد نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی سٹارٹ کی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

کیا یودا ٹھیک کہہ رہا تھا؟ وہ واقعی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے؟ پسند تو وہ اسے واقعی نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس غیر ملک میں وہ اسے چھوڑ کر کہاں جاسکتی تھی آخر؟ اس کا دماغ یہ سوچ سوچ کر سن ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی زندگی میں آئی ہر عورت تو اسے چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔ پہلے امے اور آیت، پھر کومل اور آج ہائمہ بھی کھو گئی تھی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

گھر پہنچنے تک بارش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ پورا شہر جل تھل ہو گیا۔

"نورفیاہ کی کسی دوست کے ساتھ نہ ہوں وہ۔ خیر تم اندر جاؤ۔ کوئی بینڈیج وغیرہ لگاؤ۔ میں کوشش کرتا ہوں کسی سے پتا کروا

سکوں۔" احمد اسے تسلی دے کر چلا گیا۔

گھر جا کر اس نے ذہن کو ذرا ریلکس کرنا چاہا۔ لیکن ٹینشن تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ہر گزرتے سیکنڈ کے ساتھ اس کی تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے جکارتا میں موجود اپنے ہر دوست سے پتا کروایا لیکن ہائمہ کو یہاں کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے ہو چکے تھے اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے لیکن اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اب پولیس کو اطلاع دینے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

پھر وہ پولیس سٹیشن گیا۔ وہاں اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا کر وہ دوبارہ گھر چلا آیا۔ کیا پتا وہ گھر آ چکی ہو۔ ایک ہلکی سی امید تھی اس کے دل میں۔ لیکن امیدیں اتنی جلدی کب پوری ہوتی ہیں بھلا؟ گھر داخل ہوا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ بارش خوفناک آواز لیے تڑاتڑا برس کر پورے گھر کو بھگو چکی تھی۔ وہ بھی پورا بھیگ گیا تھا لیکن اسے کہاں اپنا ہوش تھا۔ بس پورچ میں کھڑا ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔

فون کان سے لگا تا وہ مسلسل اپنا سر دبا رہا تھا۔ دوسری طرف فون ذرا دیر سے اٹھایا گیا۔

"اسلام علیکم امے!" اس نے ایک تھکن زدہ سانس لی۔

"وعلیکم سلام بیٹے۔ کیا ہوا، سانس کیوں چڑھا ہوا ہے؟ بھاگ رہے تھے کیا؟" ان کی شفیق آواز فون میں ابھری۔

"امے وہ..." اس نے یہی سوچ کر انہیں کال کی تھی کہ ہائمہ کی گمشدگی کی اطلاع دے مگر وہ ایک لمحے کو ٹھہر گیا۔ وہ تو ٹینشن میں تھا ہی لیکن اتنی دور اپنے گھر والوں کو پریشان نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں بتا کر کونسا وہ مل جانی تھی۔ اسے خود اکیلے ہی اسے ڈھونڈنا تھا۔

"آحل۔ بیٹے کیا ہوا۔ بول کیوں نہیں رہے؟" دوسری طرف وہ اس کی طویل خاموشی پر بولی تھیں۔

"جی میں ٹھیک ہوں امے۔ ہائمہ بھی ٹھیک ہے۔ بس ایسے ہی آپ کا حال پوچھنا چاہ رہا تھا۔" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ اور پانچ منٹ ان سے بات کرنے کے بعد کال کاٹ دی۔ وہ مڑ کر اندر جانے ہی لگا تھا کہ گھر کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

وہ رک کر دیکھنے لگا۔ مین گیٹ کے لاک میں کسی نے چابی گھسائی اور پھر دروازہ اندر کی طرف کھلا۔ آنے والے نے چھتری آدھی فولڈ کر کے دروازے میں گھسائی اور پھر پیر اندر رکھا۔ اور اسے لگا جیسے اس کے جسم پر کسی نے پانی کی ٹھنڈی پھوار کر دی ہو۔

وہ چھتری سر پر تان کر مصروف سے انداز میں دروازہ بند کر کے پلٹی۔ اسے دیکھ کر ایک پل کو رکی۔ پھر اس نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ آحل کے تیور دیکھ کر رکی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے پاس جا کر رکا۔

"کہاں چلی گئی تھی ہائمہ؟" وہ ہارے ہوئے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں... میں گم گئی تھی۔ میرا فون گم گیا تھا۔ کسی نے مجھ سے چھین لیا اور میں..." وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کر رہی تھی۔ پورے دن کی تھکی ہاری لگتی تھی۔

"ڈیم اٹ۔ کہاں گئی تھی تم؟ مجھے بتا کر جانے میں کونسی محنت لگتی تمہاری۔ اندازہ ہے کہ میں کتنا خوار ہوا ہوں؟" اسے غصہ آنے لگا۔

"میں بس اپنے کسی کام سے..."

"بھاڑ میں گیا تمہارا کام۔ مجھے اتنے گھنٹوں کی ازیت دے کر تم کہہ رہی ہو کہ اپنے کام سے گئی تھی۔" وہ غصے سے آگے بڑھا تو ہائمہ دو قدم پیچھے ہوئی۔ پھر اس کے بالوں پر نظر پڑی۔ بارش کی بوندیں ان سے ٹپک رہی تھیں۔ نظر بالوں سے گزر کر ماتھے کے زخم پر ٹکی، جس سے ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر بھیگ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار آگے ہو کر چھتری اس کے سر پر تانی تو آحل نے ایک جھٹکے سے چھتری کو پرے پھینک دیا۔

"بتاؤ کہاں گئی تھی؟" وہ اتنی اونچی آواز میں بولا کہ وہ بدک کر پیچھے ہوئی۔

"وہ... سماویہ۔ میں اس کے بابا کو ڈھونڈنے گئی تھی۔ اس نے مجھے رکویسٹ کی تھی کہ میں انڈونیشیا آ کر اس کے بابا کو ڈھونڈوں۔ میں بس اس کی مدد کرنے کے لیے... اس نے ایڈریس بھیجا تھا ایک۔ میں وہیں گئی تھی۔" اس نے سچ سچ بتانا شروع کیا۔

"مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا؟... ہاں، میں ہوتا بھی کون ہوں جسے تم بتا کر جاؤ گی۔ اجازت لینا تو بہت دور، تم نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ایک میں گدھوں کی طرح پورے شہر میں تمہارے پیچھے خوار ہوتا پھر رہا ہوں۔" وہ ہاتھ جھلا کر کہہ رہا تھا۔ "صبح سے

بھوکا پیاسا تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ ٹینشن سے دماغ پھٹنے کو ہے۔ تھانے میں رپورٹ لکھوا چکا ہوں۔ احمد الگ خوار ہو رہا ہے۔ یودا سے میں لڑائی کر کے آیا ہوں۔ اور تم کہہ رہی ہو اپنے کام سے گئی تھی۔ واہ ہائمہ بی بی۔"

"سوری۔" وہ لب کاٹتی، اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روک رہی تھی۔ دونوں پوری طرح بارش میں بھیگ چکے تھے۔

"واٹ سوری ہاں؟" اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر تھوڑا اوپر کیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھ کر وہ بولا۔ "میری تکلیف کا اندازہ ہے تمہیں؟ اندازہ کر سکتی ہو میں کس ازیت سے گزرا ہوں؟ اگر تم ابھی نہ آتی تو... مجھے لگا تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ امے کی طرح تم بھی مجھے چھوڑ گئی ہو۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دل باہر نکلنے والا تھا۔" وہ غصے میں کیا بول رہا تھا اسے خود اندازہ نہیں تھا۔

اور وہ تو اس کی آنکھوں کو اتنے قریب سے دیکھ کر سانس تک لینا بھول گئی تھی۔ اس کی سنہری، پانی سے بھری آنکھیں اس کے الفاظ کی عکاس تھیں۔

اور بس... اس پل ہائمہ کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ دھڑکتا تو وہ پہلے بھی تھا۔ لیکن آج... ہائمہ یوسفزئی کا دل، آحل اسفندیار خان کے نام سے دھڑکا تھا!

"میں نے اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں کو جگہ دی ہے۔ اور وہ سب بے وفا نکلیں۔" ایک جھٹکے سے اسے چھوڑتا وہ پیچھے ہٹا۔ "تم بھی مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہو نا۔ ٹھیک ہے، میں کوئی اعتراض نہیں کرونگا۔ لیکن کم از کم مجھے بتا کر جانا۔ میں تمہارے انتظار میں تو نہیں رہوں گا۔" ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔

اور وہ وہیں بارش میں کھڑی اپنی دھڑکنوں کو شمار کرتی رہی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

پچھلی رات کو سماویہ نے اسے کچھ اور بھی تصاویر ڈھونڈ کر بھیجی تھیں۔ ان پر بھی وہی ایڈریس درج تھا جو پہلے اس نے بھیجا تھا۔ نور فیاہ سے پوچھا تو اس نے قریب ہی کوئی جگہ بتائی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کل سماویہ کے بابا کو ڈھونڈنے جائے گی۔ آج صبح جب سماویہ کی کال آئی تو وہ کچن میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں فون کان سے لگائے اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ناشتے کی ٹرے آحل

کو دے کر کچن سے باہر نکل آئی۔

"چلو ٹھیک ہے، میں نور فیاہ سے بات کرتی ہوں۔ اگر وہ مصروف نہ ہوئی تو اسے ساتھ لے جاؤں گی..." تھوڑی دیر تک اس سے بات کر کے جب وہ واپس کچن کی طرف آئی تو آحل ٹیبل سے اٹھ رہا تھا۔ اس نے سوچا ابھی بات کر لے لیکن آحل جلدی میں لگ رہا تھا۔ وہ آج کل یہیں سے اپنے آفس کے کام کر رہا تھا جس کے لیے اسے اکثر باہر جانا پڑتا تھا۔ سو اس نے سوچا جب وہ واپس آجائے گا تب بتا دے گی۔

آحل کے جانے کے بعد اس نے نور فیاہ کو کال کی، اس نے بتایا کہ آج وہ کہیں جا رہی تھی۔ نور فیاہ بے چاری کو اپنے سو کام تھے، وہ خود بھی ہر وقت اس کے سر پر مسلط نہیں ہونا چاہتی تھی۔ سو اس نے الگ ہی وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ جلدی سے اس نے کچن سمیٹا اور کمرے میں آکر اپنا سکارف پہنا، فون، پرس اور چابیاں اٹھا کر وہ باہر آئی اور مین گیٹ کو باہر سے لاک کر دیا۔ آحل نے ویسے بھی لیٹ ہو جانا تھا، اس نے سوچا اس وقت تک وہ واپس آچکی ہو گی۔

وہ گوگل میپ کی مدد لیتے ہوئے فری بس لے کر اس جگہ تک پہنچی۔ وہ جکارتا کا ایک ایلیٹ کلاس ایریا تھا۔ جہاں بہت بڑے بڑے بنگلے شان و شوکت سے کھڑے تھے۔ ایک گھنٹہ تو اسے وہ گھر ڈھونڈنے میں ہی لگ گیا تھا۔ پاکستان ہوتا تو کسی سے پوچھ ہی لیتی، مگر یہاں کی زبان اسے بولنی نہیں آتی تھی۔ دو تین لوگوں سے بمشکل انگریزی میں بات کر کے پوچھتی تو وہ اس جگہ سے انجان ہوتے۔

پھر کسی طرح میپ کے ذریعے وہ اس گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ سفید محل نما، قریباً چار پانچ کنال کا وسیع بنگلہ باہر سے ہی بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ گھر کے تین گیٹس تھے۔ جن پر باوردی گارڈ ڈیوٹی دے رہے تھے۔ کچھ پل کے لیے وہ وہیں کھڑی اس گھر کو دیکھتی رہی۔ اگر یہ وہ گھر ہی نہ ہوا تو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہاں اب کوئی اور رہتا ہو۔ ایسے ہی اس کے دماغ میں خیال آیا کہ اسے یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ لیکن پھر اس خیال کو جھٹکتی وہ آگے بڑھی۔ اب یہاں تک آگئی تھی تو پوچھنے میں کیا مسئلہ تھا بھلا۔

"ایکسکیوز می!... کیا یہ وکال انداہ سری کا گھر ہے۔" ایک گارڈ کے پاس جا کر وہ انگریزی میں بولی۔ اس بوڑھے گارڈ نے ہائمہ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ پھر اوپر سے نیچے تک اس کا جائزہ لیا۔ اور دوبارہ سے سامنے دیکھنے لگا۔ وہ دو منٹ اس کا چہرہ دیکھتی رہی لیکن آگے سے

کوئی جواب نہ پا کر وہ مایوس ہو گئی۔ شاید اس بے چارے کو انگریزی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"وکال سر اس وقت شہر سے باہر ہیں۔" اس نے پلٹ کر اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ گارڈ اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ کسی روبوٹ کی طرح۔

"ارے واہ!... تمہیں تو انگریزی آتی ہے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "اُف شکر ہے مجھے ان کا گھر مل گیا۔ اب کیا تم ان سے ملنے میں..." وہ ابھی بولی بھی نہیں تھی کہ اس کھڑوس گارڈ نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔

"وہ ہر ایرے غیرے سے نہیں مل لیتے۔ پہلے آپ اپنی اپوئنمنٹ لے کر آئیں۔"

"لیکن میرے پاس کوئی اپوائنمنٹ نہیں ہے۔ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملی۔"

"پھر اب ملنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کا تو سن کر منہ ہی کھل گیا تھا۔ اتنا کرارا جواب؟ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہائمہ کو ان سے کوئی آفس وغیرہ کا کام تھا جیسے آئے دن کوئی نہ کوئی ان کے در پر ہوتا تھا۔

اسے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ وکال انداہ سری کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ جکارتا کا ایک نامی گرامی بزنس مین تھا، اسی لیے اس کی سیکیورٹی سخت تھی۔

مگر ان سے ملنا بھی ضروری تھا۔ سو وہ وہیں کھڑی اس گارڈ کے ساتھ بحث کرنے لگی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ چاروناچار وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ پھر اس بنگلے کے پچھلی طرف والے گیٹ پر آئی۔ وہاں بھی گارڈز سخت پیرا دے رہے تھے۔ آج اسے یقیناً بہت دیر ہونے والی تھی، لیکن شام تک کا اندازہ تو بلکل نہیں تھا اسے۔

وہ واپس مین گیٹ پر آ کر وہیں ٹہلنے لگی۔ ابھی جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ سامنے ایک گاڑی آ کر رکی۔ ڈرائیور باہر نکلا اور پچھلا دروازہ کھولا تو اندر سے ایک لڑکی نکلی۔ اس نے جینز ٹاپس پہن رکھا تھا، اور سر پر چھوٹا سا سٹالر لیا ہوا تھا۔ اس لڑکی کو وہ پہلے کہیں دیکھ چکی

تھی۔اس کی شکل کسی سے ملتی تھی۔ کس سے ؟اسے یاد نہیں آرہا تھا۔

ہاتھ میں پرس لیے وہ آگے آئی اور ڈرائیور سے کچھ کہا۔وہ سر ہلا کر دوبارہ سے گاڑی سٹارٹ کر کے چلا گیا۔اسے شاید کہیں اور جانا تھا۔وہ چھوٹی سی ہیل سے ٹک ٹک کرتی گیٹ تک آئی۔گیٹ کے داہنے طرف کھڑی ہائمہ پر اس کی نظر پڑی تو گارڈ کو دیکھا۔وہ انڈو میں کچھ بتانے لگا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔اور پھر ہائمہ تک آئی۔

"آپ کو بابا سے کیوں ملنا ہے؟"وہ انگریزی میں بولتی مسکرائی تو اس کے دائیں گال میں ایک ڈمپل بنا۔اور ہائمہ کو لگا جیسے اس کے ہاتھ خزانہ لگ گیا ہو۔یہ وہی لڑکی تھی جو اس دن گروسری سٹور میں تھی۔وہ اسے ہو بہو سماویہ لگ رہی تھی۔

یعنی...یعنی وہ سماویہ کی بہن تھی؟وہ ٹھیک جگہ آئی تھی۔اسے یہ سوچ کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔کچھ پل تو وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس لڑکی نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا تو وہ ہوش میں آئی۔

"مجھے کوئی آفیشیل کام نہیں ہے ان سے۔ایک پرسنل کام تھا۔آپ انہیں یہاں بلا لیں،وہ مجھے پہچان لیں گے۔بس دو منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔پھر چلی جاؤں گی۔"اس لڑکی نے اس کی نقاب سے جھلکتی آنکھوں کو دیکھا۔

"آجاؤ۔"اس نے گارڈ کو اشارہ کیا تو وہ پیچھے ہٹا۔"بابا اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔تم اندر آکر ویٹ کر لو۔شاید بارش شروع ہونے

والی ہے۔"وہ آسمان پر چھائے کالے بادلوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ہائمہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی اندر آئی۔اسے ملازم کے حوالے کرتے ہوئے وہ اندر چلی گئی۔ملازم اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر واپس چلا گیا۔تھوڑی دیر وہ بیٹھی رہی لیکن جب کوئی نہ آیا تو اس نے دروازہ کھٹکایا۔

"یس میم؟"دروازہ کھلا تو وہی ملازم پانی کا گلاس لے کر اندر آیا۔

"میں تمہاری مالکن سے ملنا چاہتی ہوں۔"وہ کھڑی ہوئی۔ملازم گلاس رکھ کر باہر چلا گیا۔دو منٹ بعد وہ اندر آیا اور اندر گھر کی طرف اشارہ کیا۔وہ اپنا پرس کہنی پر ٹکائے ایک گہری سانس لیتی اس کے ساتھ لونگ روم تک آئی۔

"کہاں سے آئی ہو بیٹا؟" ایک دراز عمر شفیق سی عورت اس کے پاس آئیں۔

"میں پاکستان سے ہوں۔ یہاں وکال انداہ سری سے ملنے آئی ہوں۔ ان کی بیٹی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس سے پہلے کہ وہ بھی اسے چلتا کرتیں، اس نے جلدی سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"کیا تم ایشا کی دوست ہو؟" وہ یقیناً اپنی پوتی کی بات کر رہی تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ساویہ انداہ سری!" اور وہاں ایک سکوت سا چھا گیا۔ "وکال انداہ سری کی بڑی بیٹی۔ میں اس کی کزن ہوں۔ وہ اپنے بابا کو بہت یاد کرتی ہے، بس ایک دفعہ ان سے بات کرنا چاہتی ہے۔ اگر آپ..."

"کون ساویہ؟" اس کی بات کسی نے درمیان میں کاٹی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سٹائلش سی خاتون ہیل کی ٹک ٹک سے اس کی طرف آئی۔ بالوں کا نفیس جوڑا، ہلکی سی جیولری، مغربی طرز کا گھٹنوں تک آتا تنگ لباس، اور نیچے ٹائٹس۔ وہ ایک نظر میں ہی کسی ایلیٹ کلاس کی خاتون لگتی تھیں۔

"وکال انداہ سری کی بڑی بیٹی ساویہ، جو پاکستان میں ہوتی ہے۔" اس نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کانفیڈینس سے کہا۔

"وکال کی ایک ہی بیٹی ہے، اور وہ ایشا ہے۔ ہم کسی ساویہ کو نہیں جانتے۔" اس عورت نے گویا ناک سے مکھی اڑائی اور جا کر صوفے پر بیٹھی۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ اسے دیکھنے لگی۔

"پلیز آپ ایک دفعہ اپنے شوہر سے میری بات کروا لیں۔ یقیناً وہ بھی اپنی بیٹی سے ملنا چاہتے ہونگے۔"

"اے لڑکی۔ بلاوجہ میرے شوہر پر الزام مت لگاؤ۔ تم جانتی بھی ہو کہ کس کے بارے میں ایسی بات کر رہی ہو؟ ابھی وہ ایک حکم کریں تو تمہیں اس ملک سے غائب کروا دیں۔" انہوں نے گردن تن کر کہا۔ مگر وہ ان کے رعب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پھر سے بولی۔

"لیکن آپ..."

"انف!..." وہ اونچی آواز میں بولیں تو ایشا کے ساتھ کچھ ملازمین بھی وہاں آ گئے۔ "کہہ دیا نا کہ ہم کسی سماویہ کو نہیں جانتے۔ آئندہ یہاں مت آنا۔ اسے باہر کا راستہ دکھاؤ۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے ملازم کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک نظر اس بوڑھی عورت کو دیکھا، ان کی نظروں میں کچھ تھا۔ ایک آس۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولیں۔ ایشا بھی چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

وہ چپ چاپ باہر نکل آئی۔ وہ سماویہ کی ہی فیملی تھی، لیکن انہوں نے تو اسے جاننے سے ہی انکار کر دیا۔ اسے بہت برا لگا تھا۔ گھر جاتے ہی وہ سماویہ کو کال کر کے بتا دیگی کہ اپنے باپ سے ملنے کا خواب چھوڑ دے۔ وہ لوگ اس کے لائق نہیں تھے۔

باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک نظر اس گھر کو دیکھا جس کے بیرونی گیٹ پر 'انداہ سری وِلا' لکھا ہوا تھا۔ پھر اس گارڈ کو دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر ایسے مسکرایا گویا جتا رہا ہو کہ، دیکھا۔ یہاں ہر کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ 'ہونہہ' کرتی ایک طرف سے نکل گئی۔ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ اسے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ اس دو طرفہ سڑک کے کنارے تیز تیز چلتی وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"ہمارے گھر میں کیسے سب پیار کرتے ہیں تم سے سامی۔ مگر باپ اور ددھیال کی محبت بڑی جاگ رہی تھی تمہارے دل میں۔ یہ ہیں تمہارے ددھیال والے؟ ہونہہ! تمہیں ماننے سے ہی انکار کر دیا۔" فون پرس سے نکال کر ہاتھ میں پکڑا۔ اس ارادے سے کہ ابھی سامی کو کال کرے۔ لیکن پھر اس نے سوچا ایسے ایک دم اسے بتایا تو بہت دکھ ہو گا۔ وہ سوچوں میں گم چلتی جا رہی تھی کہ اس کے ہاتھ سے کسی نے فون چھینا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہوئی تو دیکھا، ایک نوعمر غریب سے حلیے کا لڑکا اس کی طرف آ رہا تھا۔ یقیناً وہ اس کا پرس بھی چھیننے والا تھا۔ وہ سڑک بلکل سنسان تھی اس وقت۔ اور بارش تیز ہو گئی تھی۔

اس نے اپنے پرس کو دیکھا پھر ایک نظر اس لڑکے پر ڈالی، جیسے وہ قریب آیا، اس نے اپنا پرس اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور پھر بھاگنے لگا۔

"اوئے! میرا فون واپس کرو۔" وہ غصے سے چلائی۔ "میرا فون۔" وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔ "اللہ جی!" اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے کو بے تاب تھے۔ "میرا فون واپس کرو پاگل لڑکے۔" وہ اس کے پیچھے بہت دور تک بھاگی لیکن پھر سانس چڑھنے لگا تو وہ رک گئی۔ وہ لڑکا کافی دور چلا گیا تھا۔ اس تک پہنچنا اب مشکل تھا۔ اور اس بارش میں بھاگنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہیں رک کر وہ

اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔

پھر وہ ایک بس سٹاپ تک آئی۔ بارش کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ وہیں بینچ پر بیٹھ کر وہ بس کا انتظار کرنے لگی۔ فون یاد آیا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب وہ کسی سے رابطہ کیسے کرے گی؟ ڈھیر ساری تصویریں اور یونی ورسٹی کی فائلز وغیرہ۔ اُف۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ کاش وہ اس طرح اکیلی گھر سے نہ نکلتی۔

اوپر سے کوئی بس بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا یہیں پر بیٹھ کر ڈھیر سارے آنسو بہائے۔ کچھ دیر وہیں انتظار کرتی رہی لیکن گاڑیاں تیزی سے اس سڑک پر گزر رہی تھیں۔ وہاں سب اپنی زندگی کے سفر میں رواں دواں تھے۔ کوئی بھی نہیں تھا جو اس کی مدد کر دیتا۔ اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

آنسو پونچھتی وہ اٹھی اور کندھے پر پرس کی چین لٹکائی۔ پرس کو مضبوطی سے تھامے وہ تیز تیز قدم لیتی اس سڑک کے دوسرے کنارے پر آئی۔ اسے واپس وکال انداہ سری کے گھر جانا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی آپشن نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہیں سے کوئی مدد مل سکتی تھی۔ وہ واپس اسی راستے پر چلنے لگی۔

انداہ سری وِلا پہنچ کر وہ اسی گیٹ کے قریب آئی۔ وہی بوڑھا کھڑوس گارڈ چھتری کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟" وہ روکھے سے لہجے میں بولی۔ گارڈ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اب کیا ہوا؟"

"میرا فون کسی نے چوری کر لیا ہے۔ مجھے اپنے شوہر کو کال کرنی ہے۔" اس کی بات سن کر وہ اٹھا اور گارڈ کیبن تک گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک وائرلیس ٹیلی فون تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ امڈ آئی جسے وہ دبا گئی۔ اتنا برا بھی نہیں تھا وہ گارڈ۔ فون پکڑ کر اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا کہ اندر سے ڈائری نکالے جس میں اس نے ضروری نمبر لکھے ہوئے تھے۔ یہاں کے نمبر اسے یاد نہیں تھے۔ لیکن یہ کیا؟

اندر ڈائری نہیں تھی۔ اور... اور اس کا والٹ؟ اوہ اللہ!

وہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

"کیا ہوا؟"

"میری ڈائری شاید گر گئی ہے۔ اور والٹ بھی نہیں ہے۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گی۔" وہ ناچاہتے ہوئے بھی رونے لگی۔

"رونا بند کرو لڑکی۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟ میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں تمہیں ڈراپ کر دیگا۔" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"ایسے مت دیکھو۔ گھر پہنچ کر ڈرائیور کو پیسے دینے ہیں تم نے۔"

"اوکے۔" وہ خوش ہوئی۔ "لیکن۔ لیکن اگر وہ ڈرائیور مجھے کہیں اور چھوڑ آیا۔ اگر اس نے میرے ساتھ کچھ غلط کیا تو..." اسے پھر سے رونا آنے لگا۔ آج تو بات بات پر دل بھر ارہا تھا۔

"گھر سے اکیلے نکلتے وقت یہ سوچنا چاہیئے تھا۔" ابھی اس نے بولا ہی تھا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ "تم ہمارے ڈرائیور پر بھروسہ کر سکتی ہو چھوٹی لڑکی۔ اس کے علاوہ کوئی آپشن ہے تو بتاؤ۔" وہ تھوڑا نرم ہوا۔ وہ آگے سے چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی سمیت ایک ڈرائیور اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"گھر کا پتا یاد ہے یا وہ بھی نہیں یاد؟"

"یاد ہے۔" وہ آنسو پونچھتی پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھی اور ڈرائیور کو گھر کا ایڈریس بتایا۔ وہ گارڈ اپنے کیبن تک گیا اور ایک چھتری اٹھا کر اس کے پاس لایا۔

"بارش تیز ہو گئی ہے۔ ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اس نے مسکرا کر چھتری پکڑی۔

"شکریہ انکل۔ آپ نے میری بہت مدد کی۔ آپ اور انڈونیشیا ہمیشہ میری گڈ بکس میں رہیں گے۔" وہ بھی آگے سے مسکرا دیا۔

گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی تو اس نے سر پیچھے ٹکا دیا۔ وہ دل سے ممنون تھی اس گارڈ کی۔ آج اگر وہ مدد نہ کرتا تو اس کا کیا ہوتا؟ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ آج بھی دنیا میں اچھے انسانوں کی کمی نہیں تھی۔ گھر پہنچ کر جب وہ گاڑی سے نکلی اور ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہا کہ پیسے لے آئے تو اس نے منع کر دیا۔ اور چھتری سر پر تانے گھر تک آتی ہائمہ کو معلوم نہیں تھا کہ آحل اتنا غصہ بھی ہو سکتا ہے۔

نہ اسے آج سے پہلے یہ معلوم تھا کہ کسی کا غصہ اتنا خوبصورت بھی لگ سکتا ہے۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

بارش ہنوز برس رہی تھی۔ اس نے اندر آ کر کپڑے تبدیل کیے، جو پورے بھیگ چکے تھے۔ ڈرائیر سے بال خشک کرتے ہوئے وہ آحل کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ وہ بھی تو بھیگ گیا تھا۔ خیر کپڑے تو اس نے تبدیل کر ہی لیے ہونگے۔ لیکن اس نے کہا تھا کہ صبح سے بھوکے پیٹ تھا۔ اُف۔ اس کی وجہ سے اس کا پورا دن خراب ہو گیا تھا۔ ڈرائیر کو ڈریسنگ پر رکھ کر اس نے ڈوپٹہ سر پر ڈالا اور فوراً کچن میں آ گئی۔

فریج کھول کر دیکھا تو اندر صرف کچھ سبزیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کیبنیٹ کھول کر اس نے پاستہ کا پیکٹ نکالا۔ وہ مسکرائی۔ آحل کو پاستہ بہت پسند تھا۔ جلدی جلدی اس نے سبزیاں کاٹیں اور آدھے گھنٹے میں پاستہ تیار کر کے اوپر آئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ ناک کیا اور اندر چلی آئی۔

یہاں وہاں نظر دوڑائی۔ وہ بیڈ پر کمبل تانے لیٹا ہوا تھا۔ آگے آ کر اس نے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"کھانا کھا کر سو جائیں۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"آحل۔ آپ سے کہہ رہی ہوں۔ کھانا کھا لیں ٹھنڈا ہو جائے گا۔ صبح سے آپ نے کچھ نہیں کھایا۔" اس نے آنکھیں بند کر دیں لیکن کچھ بولا اب بھی نہیں۔

"پاستہ بنایا ہے میں نے۔" اس نے مسکراہٹ دبائی۔ وہ بلکل ناراض بچہ لگ رہا تھا اس وقت۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم کھالو۔" وہ کروٹ بدل کر دھیمی آواز میں بولا۔

"آپ کی آواز کو کیا ہوا؟ گلا خراب ہے کیا؟" اسے تشویش ہوئی۔ آحل اٹھ کر بیٹھا اور پھر کھانسنے لگا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ لال ہو رہا تھا۔ ہائمہ آگے آئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ تپ رہا تھا۔

"اللہ!... آپ کو تو اتنا تیز بخار ہے۔ بتایا کیوں نہیں آپ نے۔ مجھے لگا آپ ناراض... اف۔ رکیں میں کوئی دوائی لاتی ہوں آپ کے لیے۔ پورا دن بارش میں بھیگتے رہیں ہیں۔ اسی وجہ سے یہ سب ہوا۔ کس نے کہا تھا میرے پیچھے پورا شہر چھاننے کو۔ حد کرتے ہیں آپ بھی۔ میں جہاں بھی تھی، واپس تو یہیں آنا تھا۔" وہ تیز تیز بولنے کے ساتھ سائڈ ٹیبل کے دراز کھول کر دوائی ڈھونڈ رہی تھی۔ آحل چپ چاپ اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔ اسے اتنی ازیت میں ڈال کر وہ کتنے مزے سے اسی پر غصہ ہو رہی تھی۔ لیکن اس وقت اس میں لڑائی کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ پھر سے کمبل اوڑھ کر لیٹنے لگا تو وہ آگے آئی۔ "کمبل پیچھے کریں۔ اس سے تو اور تیز ہو گا بخار۔" اس کا کمبل پورا پیچھے کرتے ہوئے اس نے حکم جاری کیا اور پھر نیچے آئی۔

جلدی سے دودھ گرم کیا۔ اس میں ہلدی اور انڈہ توڑ کر ڈالا۔ امی کا آزمودہ ٹوٹکا۔ جس سے ٹھنڈ ختم ہو جاتی تھی۔ اوپر آئی تو وہ پھر سے کمبل اوڑھ کر لیٹا ہوا تھا۔

"اللہ۔ بات کیوں نہیں سنتے آپ؟" اس کا کمبل دوبارہ سے ہٹایا اور گلاس سامنے کیا۔ اس نے ایک نظر گلاس پر ڈالی پھر سامنے دیکھنے لگا۔

"تھوڑا سا بھی نخرہ کیا تو میں زبردستی پلاؤں گی۔ چپ چاپ یہ پی لیں اور ساتھ ٹیبلیٹ بھی لیں۔" اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور برا سا منہ بنا کر اندر ہی اندر کچھ بڑبڑایا۔ ٹیبلیٹ لے کر منہ میں رکھا اور دودھ کا گلاس اچک کر ایک ہی گھونٹ میں سارا پی گیا۔ وہ اپنی مسکراہٹ دباتی اسے دیکھ رہی تھی۔

"پی لیانا۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" گلاس تھماتے ہوئے وہ زکام زدہ آواز میں بولا۔

"ایسے کیسے چھوڑ دوں؟ بخار ایسے نہیں جانے والا۔ یہ تو میں نے اس لیے دیا کہ ٹھنڈ کی وجہ سے آپ کا سینہ خراب نہ ہو جائے۔ ابھی ٹھنڈی پٹیاں لے کر آتی ہوں میں۔ اور... کمبل نہیں اوڑھیں گے آپ۔" جاتے جاتے اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تھی۔

تھوڑی دیر میں وہ واپس آئی تو وہ پھر سے کمبل تان کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر سائڈ ٹیبل کے پاس آئی۔ پانی سے بھرا باؤل اور پٹیاں وہاں رکھیں۔ کمبل اس کے منہ سے ہٹایا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ وہ سوچکا تھا۔

اس کا کمبل پیچھے کر کے اس نے ایک پٹی پانی میں بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھی تو وہ ہلکا سا کسمسایا۔ ایک ایک کر کے وہ اس کے ہاتھوں اور پیروں پر پٹیاں رکھنے لگی۔ بار بار وہ پٹیاں تبدیل کرتی لیکن اس کا بخار کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی اب تھک گئی تھی۔ باؤل ہاتھ میں لے کر بیڈ کی دوسری طرف آئی اور اوپر چڑھ کر اس کے پاس بیٹھی۔ ہاتھوں سے جمائی روکتے ہوئے وہ اس کی پٹیاں تبدیل کرنے لگی۔ قریباً آدھے گھنٹے تک اس کا بخار قدرے کم ہو چکا تھا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

صبح کے قریباً چار بج رہے تھے جب اس کی آنکھ کھلی۔ رات سے سر میں جو درد ہو رہا تھا اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ دور کہیں مسجد سے آذان کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھا اور کمرے میں نظر دوڑائی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، پورا کمرہ روشن تھا۔ وہ رات کو لائٹ آف کرنا بھول گیا تھا۔ یا شاید... اس نے ایک جھٹکے سے بیڈ کی دائیں طرف دیکھا۔ ہائمہ؟ بڑے مزے سے وہ بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے سوئی ہوئی تھی۔ ساتھ میں پانی کا باؤل پڑا ہوا تھا۔ وہ شاید رات کو اس کی پٹیاں کرتی بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی۔

وہ اٹھ کر واش روم چلا گیا۔ فریش ہو کر باہر آیا تو وہ ایسے ہی سو رہی تھی۔ رات کو کیسے اس پر حکم چلا رہی تھی، اسے یاد آیا تو بے اختیار ہاتھوں کی مٹھی بندھ گئی۔

"دل تو کرتا ہے ایک پنچ دے ماروں۔" اس نے ہوا میں ہی پنچ مارا تھا۔

"ایوری ایکشن ہیز اے ری ایکشن۔" وہ بند آنکھوں سے بڑبڑائی تو وہ چونکا۔ "آپ نے نیوٹن کا لاء نہیں پڑا شاید۔" اب وہ آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی تھی۔ "آپ کو کیا لگتا ہے آپ مجھے پنچ ماریں گے تو میں آپ کو ایسے ہی جانے دونگی؟" ہاتھ کی پشت سے آنکھیں موندتی وہ بول رہی تھی۔ اسے تو لگا وہ سوئی ہوئی تھی۔ لیکن شاید وہ نیند میں بھی سنتی تھی۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ تم بھی مجھے پنچ مارو گی؟" وہ ابرو اچکا کر بولا۔

"بلکل۔ بہت خوشی سے۔" اس نے معصوم سی شکل بناتے ہوئے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"تم کر سکتی ہو یہ؟" وہ اسے چیلینج کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں۔ آپ میری پاور..." وہ بولتے بولتے رکی۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔ اپنے پاس پڑا موبائل اٹھا کر وقت دیکھا۔ اس کا تو منہ ہی کھل گیا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"اللہ اللہ اللہ!... میں نماز پڑھے بغیر ہی سو گئی تھی۔" وہ تیزی سے بیڈ سے اتری۔ "ہٹیں سامنے سے۔" اس سے ٹکراتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی۔ "توبہ توبہ آج کل میری نمازوں کو کیا ہو گیا ہے۔ سیدھی جہنم میں جاؤں گی میں تو۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔" استغفار کرورد کرتی وہ واش روم کی طرف بھاگی۔

وضو کر کے باہر نکلی تو وہ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ جائے نماز بچھا کر اس نے رات کی قضا پڑھی اور پھر صبح کی نماز ادا کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

"اللہ۔ مجھے معاف کر دینا پلیز۔ آئیندہ ایسا نہیں ہو گا۔ اور، آحل کو بھی نماز کی توفیق دے دینا اللہ۔ یہ بھی تو تیرا بندہ ہے، اس کا دل کھول دے۔ ہم سب پر اپنا کرم کر دے اللہ۔ ہمارے دلوں کو اپنی محبت سے بھر دے یا اللہ!... کاش کہ یہ ابھی اٹھ کر نماز پڑھ لے۔ کاش۔" اس کے دل میں ایسے ہی ایک خواہش جاگی تھی۔

دعا کر کے اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ ابھی اٹھنے ہی لگی تھی کہ دوسری طرف ایک جائے نماز بچھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ جائے نماز پر کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں گیلے تھے۔ وہ ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کی سانس روک دی ہو۔

کیا واقعی؟ اتنی جلدی دعائیں قبول ہوتی ہیں؟ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا اٹھ ہی گیا ہوں تو نماز پڑھ لوں۔" وہ اس کی نظروں کی تپش محسوس کرتے ہوئے بولا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر بے اختیار سجدے میں چلی گئی تو آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

اللہ تو اتنا پیار کرنے والا ہے۔ دل سے کی جانے والی دعائیں مانگنے سے پہلے ہی پوری کر دیتا ہے۔ بس ہم ہی اس کے قریب نہیں جاتے۔ دنیا کی رعنائیوں میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ اسے بھول جاتے ہیں۔ جیسے وہ کل رات کو نیند کی شدت میں اسے بھول گئی تھی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

"میں اس کے بابا کو جانتا ہوں۔" ناشتے کی ٹیبل پر وہ پر سکون سا بیٹھا پاستا کی پلیٹ میں چمچ ہلاتا کہہ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟" آحل نے نظر اٹھا کر ہائمہ کو دیکھا۔ پھر خود کو کمپوز کرتا بولا۔

"تم نے خود ہی نام بتایا ہے۔ انہیں کون نہیں جانتا جکارتا میں۔" اس نے کندھے اچکائے۔ ہائمہ نے کل کے دن کی روداد اسے سنائی تھی۔ اور سماویہ کے بابا کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں ان سے ملنے میں۔"

"سچی؟" وہ خوشی سے بولی تو اس نے سر ہلایا اور پھر چمچ منہ میں ڈالا۔

"مجھے ان کے آفس کا ایڈریس پتا ہے۔ وہیں چلیں گے کسی دن، یقیناً وہ تم سے مل کر خوش ہونگے۔ انہیں جب اپنی بیٹی کے بارے میں

پتا چلے گا تو وہ خود بھی اس سے ملنا چاہیں گے۔"

"ان شاء اللہ!" وہ مسکرائی۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"آحل۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "میرا موبائل فون... اس میں میری پکچرز تھیں۔ اور بھی بہت سا ڈیٹا تھا۔ کوئی مس یوز نہ کر لے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" پریشانی میں وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"فکر نہیں کرو کچھ نہیں ہو گا۔" وہ پر سکون تھا۔ اس کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی اور وہ کیسے پر سکون تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔

"ہاں... آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر کچھ غلط ہوا تو میرے ساتھ ہو گا۔ میری پکچرز آوٹ ہوئیں تو میں ہی بدنام ہو نگی۔ آپ کو کیوں..." اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی جب آحل نے اپنا فون اس کے سامنے کیا۔

"یہ... اس کا کیا کروں میں؟" اس نے فون نہیں پکڑا۔ "آپ کو لگتا ہے میں نئے فون کے لیے یہ سب کہہ رہی ہوں؟" اسے گہرا صدمہ ہوا۔

"ایک دفعہ دیکھو گی؟" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ اوہ اللہ... کتنا بولتی تھی یہ لڑکی۔

اس نے غصے میں ہی فون اس کے ہاتھ سے لیا اور اپنے سامنے کیا۔ وہاں میسجز کا انبا کس کھلا ہوا تھا۔

"پہلی چیٹ کھول کر دیکھو۔" اس نے وہی کھولا۔ وہ کسی موبائل کمپنی والوں کا نمبر تھا۔

"سر، جس موبائل کی ڈیٹیلز آپ نے بھیجی تھیں وہ بلاک کر دیا گیا ہے۔ اسی ماڈل کا نیا فون جو آپ نے آرڈر کروایا تھا وہ ایک ہفتے کے اندر ہی آپ کو ڈیلیور ہو جائے گا۔ ہمارے ساتھ تعاون کرنے کا شکریہ۔" اس سے اوپر آحل کی چیٹ تھی جس میں اس نے فون کی ڈیٹیلز وغیرہ بھیجی ہوئی تھیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر بے یقینی سے آحل کو دیکھا۔

"یہی فون تھا تمہارا؟" اس سے کوئی جواب تک نہیں بن پایا۔ "کل شام کو جب تم نے بتایا تو اوپر جا کر سب سے پہلا کام میں نے یہی کیا

تھا۔اس کمپنی کا آفس کراچی میں ہے۔انہیں کال کر کے میں نے تمہارا فون بلاک کروا دیا تھا۔اب وہ صرف ایک ڈبہ ہے جو استعمال کے لائق نہیں رہا۔اور ویسے بھی تمہارا پاسورڈ لگا ہوا تھا،جب تک اس چور نے فون کھولا ہو گا،وہ بلاک ہو گا۔سو نو ٹینشن۔"وہ ٹشو سے منہ پونچھتا اٹھا۔"دو تین دن تک کوریئر والا آجائے گا نیا فون دینے۔"اور پھر کرسی واپس دھکیل کر کچن چلا گیا۔وہ بس اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

کیا تھا یہ شخص؟

کیوں اسے ہر دفعہ حیران کر دیتا تھا؟

بنا کچھ جتائے وہ ہمیشہ اس کی مدد کر دیتا تھا۔بنا کچھ کہے وہ انکے رشتے کو معتبر کر دیتا تھا۔پھر ایسے انسان سے محبت کیسے نہ ہوتی؟

کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے وہ بلاوجہ ہی مسکرانے لگی۔اسے اپنی رگوں میں سکون سا دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ محبت زندگی کا سکون برباد کر دیتی ہے،لیکن یہی محبت اگر ایک اچھے انسان سے ہو جائے تو کھویا ہوا سکون بھی واپس مل جاتا ہے۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔آج تیسرا روزہ تھا۔سہ پہر کا وقت ہو رہا تھا۔رات سے ہوتی بارش اب تھم چکی تھی۔لیکن ہوا میں اب بھی خنکی موجود تھی۔اور آسمان پر بادلوں نے چھایا بنا رکھی تھی،ساتھ نکلا سورج بھی آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔وہ کچن میں کھڑی کام کر رہی تھی۔کانوں میں ہینڈ فری لگائے وہ ہاتھ بھی چلا رہی تھی۔

"امے کا آفس کیسا جا رہا ہے؟"

"آج کل تو بس ورکرز کے ذمے ہے سب کچھ۔روزے کی وجہ سے امے کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تو کم ہی جاتی ہیں۔"دوسری طرف سے آیت کی آواز گونجی۔

"ان کا خیال رکھا کرو آیت۔ میری جب بھی بات ہوتی ہے ان کی آواز بہت ڈل لگتی ہے۔"

"رکھتی تو ہوں۔ لیکن وہ تمہیں اور بھائی کو بہت یاد کرتی ہیں۔ اتنے سالوں سے بھائی ہمارے ساتھ ہوتے تھے ہر رمضان میں۔ اور تمہارا تو پہلا رمضان ہے شادی کے بعد، تم بھی نہیں ہو یہاں۔ کتنا مزا آتا اگر تم لوگ یہاں ہوتے۔"

"مجھے بھی تم لوگوں کی بہت یاد آتی ہے۔ لیکن کیا کر سکتے ہیں آیت۔ بس اللہ نے قسمت میں جتنا وقت یہاں لکھا ہے وہ گزار رہے ہیں۔ ورنہ کس کا دل چاہتا ہے یہاں غیر ملک میں اتنا عرصہ رہنے کو۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

کچھ دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد اس نے کال کاٹ کر فون رکھ دیا اور جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ آج اس نے نورفیاہ اور احمد کی دعوت رکھی ہوئی تھی۔ اسی کی تیاریوں میں ایک گھنٹے سے کچن میں لگی ہوئی تھی۔

آحل اپنے کمرے میں بیٹھا آفس کا کام کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نیچے آیا تو وہ کچن میں کھڑی دکھائی دی۔ وہ چولہے کے ساتھ کھڑی کچھ فرائی کر رہی تھی۔ یہاں سے اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ سفید رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہم رنگ دوپٹہ ساتھ پڑی کرسی کی پشت پر پھیلا رکھا تھا۔ اس کے کھلے بال کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ بھورے بال جن میں ہلکے ہلکے کرلز آئے ہوئے تھے۔ کھڑکی سے آتی سورج کی کرنیں اس کے بالوں پر پڑتیں انہیں سنہرا کر رہی تھیں۔

اپنی پشت پر اس کی نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ پلٹی۔ وہ دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ اس کے پلٹنے پر خود کو مصروف ظاہر کرتا اندر آیا۔

"کوئی ہیلپ چاہیئے؟" اس نے ایک نظر کاؤنٹر پر پھیلی ہوئی چیزوں پر ڈالی۔

"نہیں۔ یہ کباب فرائی کر رہی ہوں۔ باقی تو سب کچھ بن گیا ہے۔ آپ بس افطاری کے بعد یہ کچن صاف کروا دیجیے گا۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی تو اس نے سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر تک نورفیاہ اور احمد آ گئے تھے۔

"نور۔ تمہیں اور احمد بھائی کو برا تو نہیں لگا اس طرح الگ الگ بٹھانے پر۔" وہ نور فیاہ کے ساتھ بیٹھی گلاس میں تازہ انار کا جوس ڈال رہی تھی۔

"اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے؟ تم پردہ کرتی ہو تو ہمیں بھی تمہاری پرائیویسی کا خیال رکھنا چاہیئے۔" اس کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے وہ مسکرائی۔ ہائمہ بھی ہلکا سا مسکرا دی۔ روزہ افطار ہو چکا تھا۔ وہ دونوں لونگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ آحل اور احمد اوپر کمرے میں افطاری کر رہے تھے۔

"تم لوگ کہیں گئے؟"

"کہاں یار۔ ابھی تو دعوتیں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔ اور پھر کووڈ کی وجہ سے جا بھی نہیں سکتے کہیں۔ ہم نے تو سوچا تھا ہنی مون پر دبئ جائیں گے۔" اس نے کانٹے کی مدد سے پلیٹ میں سے چکن کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ "ہمم... تمہارے ہاتھ میں بہت ٹیسٹ ہے۔ مجھے تو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ آصفہ بی بی بھی ایسے کھانے بنایا کرتی تھیں۔"

"یہ بریانی تو لی ہی نہیں تم نے۔" اس نے بریانی کی ڈش اسے پاس کی۔

"فکر نہیں کرو۔ یہ سب میں ختم کر کے ہی جاؤں گی۔" وہ ہنسی۔ "ویسے تم لوگ ایک اور چیز بھی بناتے ہو رمضان میں، مجھے ابھی اس کا نام یاد نہیں آ رہا، ایسے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں..." وہ یاد کرنے لگی۔

"پکوڑے؟"

"اوہ ہاں، پکورے۔ وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ یہاں ایک انڈین ریسٹورانٹ ہے، وہاں بھی ملتے ہیں۔"

"اف، کیا یاد کروا دیا تم نے۔ ہم پاکستانیوں کا تو روزہ ہی پکوڑوں سے کھلتا ہے۔" اس نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "یہاں تو مجھے چنّے کا آٹا ہی نہیں مل رہا۔"

"چلو کسی دن انڈین ریسٹورانٹ چل کر کھائیں گے دونوں۔" اس نے چٹکیوں میں حل نکالا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ لوگ چلے گئے تو ہائمہ کچن میں آئی اور سامان سمیٹنے لگی۔ اس وقت کچن بہت برا نظارا پیش کر رہا تھا۔ سب کچھ ادھر ادھر پھیلا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر وہ کب سے کھڑی بس سوچ ہی رہی تھی کہ اس پھیلاوے کو کہاں سے سمیٹنا شروع کرے۔ اس نے ایک گہری سانس باہر کو خارج کی۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس لمبی تان کر سو جائے۔

"چچ۔ چچ۔ یہ سب ایسے کیوں پھیلا رکھا ہے؟" آحل پاؤں بچاتا ہوا واٹر کولر تک آیا کیونکہ نیچے بھی کچھ برتن رکھے ہوئے تھے۔

"ابھی آپ ہیلپ کروائیں گے نا میری۔ ایک منٹ میں سب ہو جائے گا دیکھنا۔" اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔ اور آحل نے پانی پیتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی۔ اس نے تو بھئی صرف مروتاً کہا تھا۔ یہ تو واقعی اس سے کام کروانے والی تھی۔ وہ تو جیسے کب سے تیار کھڑی تھی کہ وہ آئے اور کام شروع کروا دے۔

"ہونہہ۔" وہ برا سا منہ بنا کر بازو فولڈ کرنے لگا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

یہ اس سفید محل نما بنگلے میں موجود وکال انداہ سری کا بیڈ روم تھا۔ بیڈ کے سامنے رکھے کاؤچ پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے وکال انداہ سری کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی اس کی بیوی (اولیانہ) بڑے خوشگوار موڈ میں لگ رہی تھی۔ کافی کا مگ ہاتھ میں پکڑے وہ اس کی طرف آئی۔ پاؤں کو چھوتا ڈھیلا سا سلیولیس گاؤن اور کھلے شولڈر کٹ بال کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔

"تمہاری کافی۔"

"پچھلے ہفتے کوئی لڑکی آئی تھی ہمارے گھر؟" انہوں نے کافی لینے کی بجائے ان سے سوال کیا۔

"کیسی لڑکی وکال۔ کس کی بات کر رہے ہو؟" مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے خود کو کمپوز کیا۔

"میرے سامنے بلکل بھی ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب جان گیا ہوں میں۔ سماویہ کی کوئی جاننے والی آئی تھی یہاں۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا تو تم نے یہ کہہ دیا کہ سماویہ میری بیٹی نہیں ہے؟"

"تمہیں یہ کس نے کہا۔" وہ چونک گئی تھی۔

"کسی نے بھی کہا ہو، فرق اس سے پڑتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔"

"وکال دیکھو، تم جانتے ہو نا وہ کیسی عورت کی بیٹی ہے۔ میں تو بس تمہیں..." اس نے وکال کا بازو پکڑتے ہوئے اسے شانت کرنا چاہا۔

"وہ میری بیٹی ہے۔ سماویہ... میری بیٹی ہے۔" اس نے کھڑے ہو کر اپنے سینے پر دستک دیتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"تھی۔ اب تمہاری بیٹی ایشا ہے۔ اس پر غور کرو وکال۔ تم نے دیکھا ہے وہ آج کل کتنی گم سم رہنے لگی ہے۔ اسے ہماری توجہ..."

"وہ بھی تمہاری وجہ سے ایسی بنتی جا رہی ہے۔ کیا یہ سب اسے نہیں پتا؟ جس دن وہ لڑکی آئی تھی، کیا ہمارے بچے نہیں تھے وہاں؟ انہوں نے نہیں سنا یہ سب؟ تم آخر کس سے چھپانا چاہتی ہو میری بیٹی کو۔"

"اوہ۔ تو تمہیں ایشا نے بتایا ہے یہ سب۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "وہ تو پاگل ہے۔ اسے یہ نہیں پتا اگر تمہاری دوسری بیٹی آ گئی تو اس کی تمہاری زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہے گی۔"

"بس کر دو اولیا! کسی نئے شخص کے آ جانے سے پچھلے رشتوں کی اہمیت کم نہیں ہوا کرتی۔ اور تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تم سب سے پہلے 'وہ' میری زندگی کا حصہ تھی۔ تم اسے چاہ کر بھی مجھ سے الگ نہیں کر سکتی۔ مجھے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس عورت کی بیٹی ہے۔ وہ میرا خون ہے۔ تم دونوں عورتوں نے تو میری زندگی کو ویسے بھی کھوکھلا کیا ہوا ہے۔ ایک میری بیٹی کو سات سمندر پار لے گئی اور اس کے بعد کبھی ملنے نہیں دیا۔ اتنے برس بیت گئے لیکن میں اپنی بیٹی کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس گیا ہوں۔ اور تم... تم تو چاہتی ہی نہیں کہ تمہارے علاوہ میرے گھر اور زندگی میں کسی کو حصہ ملے۔ اب اگر اس سے ملنے کا ایک ذریعہ اللہ نے بنا دیا تو تم نے وہ بھی ختم کر دیا۔" انہیں غصہ آنے لگا۔

"ہونہہ۔ اب تک غائب تھی، نہ باپ کی یاد آئی نہ اس ملک کی۔ جانے اب کہاں سے پیدا ہو کر آ گئی ہے۔ ضرور تمہاری جائداد میں اپنا حصہ مانگنے کے لیے یہ سب کر رہی ہے۔ اس کی ماں جتنی شاطر ہے نا اسے یہی سب سکھایا ہو گا۔ لیکن میں بتا رہی ہوں وکال۔ میری زندگی میں وہ لڑکی یہاں نہیں آئے گی۔"

"تم ہوتی کون ہو یہ طے کرنے والی ہاں؟" وہ بہت اونچی آواز میں بولے تھے۔ "یہ گھر میرا ہے اور اس میں کون رہے گا کون نہیں، اس کا فیصلہ میں کروں گا۔ مت بھولو تمہیں کیسی جگہ سے لا کر اس محل کی ملکہ بنا رکھا ہے میں نے۔"

"تو تم مجھے نکلنے کی دھمکی دے رہے ہو؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"جو میری بیٹی کو قبول نہیں کرے گا اس کی میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں۔" اس کی آنکھوں میں سرد تاثر تھا۔

"میں ہرگز نہیں جاؤں گی یہاں سے۔" وہ چیخی۔ "یہ میرا گھر ہے۔ اتنا شوق ہے اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے کا تو تم چلے جاؤ۔" وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ اور ان کے شور کی وجہ سے سب وہاں آ گئے تھے۔

"اللہ جی۔ کیا ہو گیا ہے اولیا۔ کیوں اتنا چیخ رہی ہو؟" وکال کی ماں کمرے میں آتے ساتھ بولی۔ "کچھ تو خیال کرو، سب ملازم تمہاری آواز سن کر آ گئے ہیں۔"

"یہ آپ اپنے بیٹے سے کیوں نہیں کہتیں؟ اسے کیوں خیال نہیں آیا کسی کا؟ اس عمر میں مجھے گھر سے جانے کا کہہ رہا ہے۔" وہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے سوں سوں کرنے لگی۔ انہوں نے بے یقینی سے وکال کو دیکھا۔ اولیانہ آنسو بہاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"مجھے آپ سے یہ امید ہرگز نہیں تھی ابو۔ آپ نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا۔" اس نے الٹا ان سے گلا کیا تو وہ حق دق رہ گئیں۔ "آپ اچھے سے جانتی ہیں کہ میں نے اس سے ملنے کی کتنی کوششیں کیں ہیں لیکن ہر دفعہ ناکامی ہوئی۔ اب وہ خود مجھے ملنا چاہتی ہے تو آپ لوگوں نے اس کا راستہ روک دیا۔ کیا آپ کو اس کی یاد نہیں آتی؟ وہ آپ کی گود میں کھیلتی تھی ابو۔ آپ کی پوتی ہے وہ۔" وہ وہیں بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔ ان کے کندھے بے ساختہ جھک گئے تھے۔

"مجھے بھی اس سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے بیٹا۔ میں بس تمہارا ہنستا بستا گھر توڑنا نہیں چاہتی۔ مجھے اولیانہ نے منع کیا تھا تو..."

"وہ مجھے اپنی بیٹی سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔ بتا دیجیئے گا اسے۔" کہہ کر وہ رکے نہیں۔ کمرے سے نکل کر وہ باہر آئے اور اونچی آواز میں اپنے سیکرٹری کو بلایا۔

"فاطر۔"

"یس سر۔" یونی فارم میں ملبوس اس کا سیکرٹری فوراً حاضر ہوا۔

"مجھے پچھلے جمعے کی سی سی ٹی وی فوٹیج چاہیئے۔ دس منٹ کے اندر۔ دیر ہوئی تو اپنے نقصان کے ذمہ دار خود ہو گے۔"

"یس سر۔ پانچ منٹ میں آپ کے پاس ہو گی۔" اس کی بات سنے بنا وہ اپنی سٹڈی میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ فوٹیج لے کر آیا۔

"مجھے اس لڑکی کی ایک ایک انفارمیشن کل تک مل جانی چاہیئے۔ اس کا فون نمبر، رہائش، سب کچھ۔" فوٹیج دیکھنے کے بعد اپنے سیکرٹری سے بولے۔

"یس سر۔" سر کو خم دیتا وہ باہر نکل گیا تو انہوں نے اپنے سامنے رکھا والٹ کھولا۔ اس کی اندرونی طرف ایک بچی کی تصویر پڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی چمکتی سیاہ آنکھیں، مسکراتے ہوئے ہونٹ اور دائیں گال میں گڑھا۔ انہوں نے وہ تصویر باری باری اپنی آنکھوں سے لگائی اور پھر مسکرا کر اسے دیکھنے لگے۔

"میں جانتا تھا میری بیٹی ایک دن خود اپنے بابا کو ڈھونڈنے نکلے گی۔ اور تب تمہیں ملنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ تمہاری ماں بھی نہیں۔"

•✶•✶•✶•✶•✶•

رمضان آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ انڈونیشیا میں روزے اتنے مشکل نہیں تھے چونکہ موسم ہمیشہ درمیانہ رہتا تھا۔ وہاں نہ ٹھنڈ ہوتی نہ ہی گرمی۔ اور اکثر بارشیں ہوتی تھیں جس کی وجہ سے موسم اور زیادہ خوشگوار رہتا۔

رات کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت فارغ بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ عشاء کی آذان کے بعد آحل مسجد چلا گیا تھا۔ اور ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ نماز شروع کر لی تھی۔ ویسے تو نماز گھر میں پڑھ لیتا اور تراویح پڑھتا نہیں تھا، آج جانے کیسے اس کو مسجد جانے کا خیال آ گیا تھا۔

وہ تراویح پڑھ کر فارغ ہو گئی تو سوچا آحل کی آگے کی کہانی پڑھ لی جائے۔ اتنے دنوں سے اسے موقع نہیں ملا تھا۔

اوپر آ کر اس نے دراز کھولا۔ آج ڈائری کی جگہ تبدیل ہوئی تھی۔ یقیناً آحل اس میں کچھ لکھتا رہا ہو گا۔ اس نے مارے تجسس کے آخری صفحہ کھولا۔

"سوچ رہا ہوں آج سے تراویح شروع کر دوں۔ اپنا آپ بڑا عجیب سا لگنے لگا ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ اللہ سے اتنی قریب ہے اور میں بس کبھی کبھار نماز پڑھ لیتا ہوں۔ وہ بھی اس سے متاثر ہو کر شروع کی تھی۔ اسے جب دیکھتا ہوں تو ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ وہ اتنی پر سکون، اتنی مطمئن کیسے ہے؟ مشکلات تو اس کی زندگی میں بھی ہیں۔ مگر وہ میری طرح اللہ سے ناراض نہیں ہے۔ میں بھی اب محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ کی قربت نے اسے کیسے اتنا پر سکون کر رکھا ہے۔ دعا کرنا مجھے بھی سکون مل جائے۔"

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ کس کی بات کر رہا تھا؟ اسے تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا تھا۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے اس نے دو تین صفحے پیچھے پلٹے۔

"میں نے شادی کر لی ہے۔ امے کی خواہش تھی کہ میں کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بساؤں۔ خوبصورت تو وہ بہت ہے۔ مگر... ہماری بنتی نہیں آپس میں۔ میرے لیے کسی لڑکی کو قبول کرنا اتنا آسان نہیں، اتنا تو تمہیں پتا ہے۔ پھر جب ہو بھی اس کی رشتہ دار... خیر۔ وہ خود بھی عجیب سی ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ اسے شادی سے پہلے ہی بتا دوں کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اس نے بات کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ شروع میں مجھے لگتا تھا کہ اس میں بہت ایٹیٹیوڈ ہے۔ اب بھی ایسا لگتا ہے مگر کبھی کبھی وہ بہت معصوم اور پیاری لگتی ہے۔" پڑھتے ہوئے اس کے ہونٹ خود بخود مسکرانے لگے تھے۔ "بولتی بہت زیادہ ہے مگر خوبصورت بولتی

ہے۔ خاص کر جب وہ اللہ کی بات کرتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک نور سا پھیل جاتا ہے۔ خیر۔ بہت ہو گئی تعریف۔ اتنی بھی اچھی نہیں لگتی مجھے وہ۔"

"ہونہہ! مجھے بھی اتنے اچھے نہیں لگتے آپ۔" پھر اس کا تصور ذہن میں آیا تو بے ساختہ مسکرائی۔ "بس تھوڑے سے۔"

وہ صفحہ وہیں چھوڑ کر وہ پیچھے گئی۔ جہاں سے اس نے چھوڑا تھا۔

وہ کیلو فورنیا سے انڈونیشیا واپس آ گیا تھا۔ یہاں آ کر اسے پتا چلا کہ بابا کی طبیعت بہت ناساز رہنے لگی تھی۔ ان کا شوگر بہت ہائی رہتا تھا، جس کی وجہ سے جسم میں اور بھی بہت ساری پیچیدگیاں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ اس کے آتے ہی انہوں نے کومل کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے بات ٹال دی۔ ان کی صحت ایسی نہیں تھی کہ انہیں مزید دکھ دیے جاتے۔

وہ اپنے لیے وہیں پر جاب ڈھونڈنے لگا۔ انجینئرنگ میں اتنا اچھا رزلٹ آنے کے بعد اسے جاب ملنا آسان کام تھا۔ لیکن اسے وقت بہت کم ملتا تھا۔ پورا دن وہ بابا کے ساتھ رہتا۔ ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ان کے علاوہ اس کے پاس تھا ہی کون؟ اس بات کا احساس اب اور زیادہ ہوتا تھا۔

"آحل۔ بیٹا تم اپنی ماں کے پاس چلے جاؤ۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ آج ہوں، کل نہیں ہوں گا۔" وہ حیران رہ گیا جب ایک رات بابا نے اس سے یہ بات کہی۔

"بابا، کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو صحت اور لمبی زندگی دے۔ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔" اس نے ان کے جھریوں زدہ ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ اس رات اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی عمر سے پہلے ہی بوڑھے ہونے لگے تھے۔ ایک چھوٹے سے شک کی بنا پر انہوں نے اپنی جان سے پیاری بیوی اور بیٹی کھو دی۔ اس گلٹ نے ان کی زندگی آدھی کر دی تھی۔

"میری ایک بات مانو گے آحل؟" وہ کھانستے ہوئے بولے۔

"ضرور بابا۔"

"بیٹا۔ کبھی بھی اپنی بیوی پر شک مت کرنا۔ دنیا اس کے بارے میں کچھ برا کہے تو اس کے سامنے دیوار کی طرح کھڑے ہو جانا۔ عورتیں بہت نازک ہوتی ہیں میرے بچے۔ ہم مرد اپنی انا اور ضد میں آ کر انہیں توڑ دیتے ہیں۔ وعدہ کرو کبھی اپنی بیوی کا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ کبھی بھی میری کی گئی غلطیاں نہیں دہراؤ گے۔ جب دنیا کی بھیڑ میں تمہاری شریک حیات اکیلی پڑ جائے تو تم اس کا ہاتھ تھام کر اس کا سہارہ بنو گے۔ اس پر بھروسہ کرو گے۔ وعدہ کرو مجھ سے۔" انہوں نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے کی۔ لیکن اس سے اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا گیا۔ وہ ان کی خالی آنکھوں میں دیکھنے لگا جہاں ایک آس تھی۔ اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں اور پھر اپنا دایاں ہاتھ ان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔ مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے تو شادی کرنے کا ارادہ ہی ختم کر لیا تھا۔ کہاں یہ کہ اپنی شریک حیات کے بارے میں سوچتا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

اگلے دن بابا کی طبیعت مزید خراب ہو گئی تھی۔ انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا۔ وہ بس کچھ دنوں کے مہمان تھے۔ ایک ہفتہ وہیں گزر گیا۔ رات کو انہوں نے آحل کو اپنے پاس بلایا۔ وہ گھنٹوں اس سے باتیں کرتے رہے۔ اپنے ماضی کی، آصفہ کی، آیت اور اس کے بچپن کی۔ قریباً رات کے تین بج رہے تھے جب اس نے زبردستی انہیں سلایا۔

صبح آذان کے وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ دعا پڑھ کر ان کے پاس بیٹھا۔ ان کی دوا کا وقت ہو رہا تھا۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر جب اس نے ہلایا، وہ برف کی طرح سرد تھا۔ ہاتھ اٹھا کر اوپر کیا تو وہ گر گیا۔ جیسے کسی بے جان چیز کو اوپر اٹھاؤ، چھوڑو تو فوراً گر جائے۔

بے جان؟ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر گزری۔

ان کی سانسیں محسوس کرنے کے لیے اس نے دو انگلیاں ان کی ناک کے نیچے رکھیں۔ اسے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ کوئی سانس محسوس

نہیں ہوئی۔ اسے لگا وہ خود بھی اگلا سانس نہیں لے پائے گا۔

ایک جھٹکے سے اس نے ہاتھ پیچھے کیا۔ اور پھر کھڑا ہوا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہاسپٹل کا یہ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے مڑ کر اس بیڈ پر پڑے اپنے باپ کو دیکھا۔ سفید لحاف میں لپٹا یہ وجود اسکا باپ تھا، اس کا سب سے اچھا دوست، اس کا استاد۔ اس کا سب کچھ تو یہی شخص تھا۔

"ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔" وہ ایک دم سے چیخنے لگا۔ "نرس۔" اس کے منہ سے الفاظ تک نہیں ادا ہو رہے تھے۔ بمشکل وہ دروازے تک آیا۔ اسی وقت نرس اندر آئی۔

"بابا۔" اس نے پژمردہ حالت میں اپنے باپ کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں کیا ہوا ہے۔"

"میں چیک کرتی ہوں۔" وہ جلدی سے ان کی طرف آئی۔ وہ وہیں دروازے میں کھڑا رہا۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی باہر نکل آئے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی جو خبر ملنے والی تھی، اس کے پاس وہ سننے کی طاقت نہیں تھی۔

نرس ایک گہرا سانس لے کر مڑی اور اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کرب سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ الفاظ کی ضرورت ہی نہیں بچی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اب صرف ایک مردہ وجود بن چکا تھا۔ مگر یہ قبول کرنا آسان نہیں تھا۔

"اِن للہ وَاِن اِلیہ رَاجعون۔" نرس ایک طرف سے گزر کر باہر نکل گئی۔ اسے ڈاکٹر وغیرہ کو خبر دینی تھی۔

وہ وہیں دروازے میں بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں زمین کو دیکھتی جیسے پتھر ہو گئی تھیں۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر وغیرہ اندر آئے۔ انہیں بیڈ سے سٹریچر پر منتقل کیا گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا بس دیکھتا رہا۔ ہوش تب آیا جب انہیں ایمبولینس میں گھر لے جایا جا رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے سر سے کفن ہٹا کر ان کا چہرہ دیکھا تو ایک آنسو ٹوٹ کر چہرے پر پھسل گیا۔ اور پھر ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے اپنے لبوں تک لے گیا۔

"آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے بابا۔"

قریباً ظہر کی نماز کے بعد اسفندیار خان کا جنازہ پڑھایا گیا۔ وہیں قریب ایک قبرستان میں انہیں دفنایا گیا۔ وہ یہاں سے وہاں بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ اسے اپنا کوئی ہوش نہ تھا۔ نہ اس کی آنکھ سے اس کے بعد کوئی آنسو نکلا۔ نہ کوئی گلہ شکوہ۔

اسے اب تیاری کرنی تھی۔ بابا کی وصیت کے مطابق اسے پاکستان جانا تھا۔ یہاں سے اپنا سب کچھ سمیٹ کر۔ ہمیشہ کے لیے۔

ایک مہینے کے اندر اس نے گھر کا بندوبست کیا۔ وکال انداہ سری اس سے ملنے آتا رہا۔ اس کا گھر کرائے پر انہی نے لگوایا۔ اس کے پاس جتنی جمع پونجی تھی، ساری بابا کے علاج میں لگ گئی۔ اب اس کے پاس بس اتنے پیسے باقی تھے کہ ٹکٹ بک کرا کر پاکستان چلا جاتا۔ وکال نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ آج کل انکا اپنا بزنس ڈاؤن چل رہا تھا۔ اور پھر کب تک ان کے سہارے جیتا؟ اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

اور پھر اپنا ٹوٹا دل لے کر وہ انڈونیشیا سے بھی چلا آیا۔ اپنے ملک۔ اپنی اصل جگہ۔ جب وہ پاکستان پہنچا تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ کوئی ٹیکسی کروالیتا۔ یا کچھ کھالیتا۔

ایک آدمی سے لفٹ لیتا وہ اس ایڈریس پر پہنچا جو اس خط کے پیچھے درج تھا۔ وہ خط جو بابا نے اپنی آخری رات اس کے حوالے کیا تھا۔ آصفہ آفریدی کے نام۔

جسے اپنی زندگی میں بھیجنے کی ہمت وہ کبھی نہیں کر پائے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ اس گھر کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ اندر جا کر کیا کہا جائے۔ اور کیا اس کی ماں اسے دیکھ کر خوش ہو گی؟ کیا اس کی چھوٹی سی گڑیا اسے پہچانتی ہو گی؟

ایک گہرا سانس لے کر وہ آگے بڑھا اور دروازے کے اوپر لگی بیل بجائی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اسے لگا جیسے کسی نے کان میں صور پھونک دیا ہو۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

وہ قدم قدم چلتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ چہرے پر برہمی صاف ظاہر تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ ہاتھ میں پکڑی ڈائری پیچھے چھپائی۔ دل البتہ زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میں..." اس نے تھوک نگلا۔ "میں تو بس ایسے ہی۔" اس نے کوئی بہانہ بنانا چاہا۔ "صفائی کر رہی تھی آپ کے کمرے کی۔"

"اس کی صفائی کر رہی تھی؟" وہ آگے بڑھا اور اس کے پیچھے بندھے ہاتھوں سے ڈائری اچک لی۔ اس نے سختی سے اپنی آنکھیں میچ ڈالیں۔

"میری ڈائری کو ہاتھ لگانے کی اجازت کس نے دی؟" وہ ڈائری کے صفحے پلٹتے ہوئے سرد آواز میں کہہ رہا تھا۔ وہ ایک طرف ہوئی۔ ابھی جانے ہی لگی تھی کہ اس کا بازو اس کی گرفت میں تھا۔ ایک جھٹکا دے کر اسے واپس اپنی جگہ کیا اور دوسرے ہاتھ سے ڈائری بیڈ پر اچھالی۔

"جواب چاہیئے مجھے۔ کس کی اجازت سے تم نے میرا دراز کھولا ہے؟ منع کیا تھا کہ میری چیزوں کو ہاتھ مت لگانا۔ ایک دفعہ کی بات سمجھ نہیں آتی؟" اسے دونوں کہنیوں سے پکڑ کر تھوڑا اوپر کیا اور چبھتی نظریں اس کی آنکھوں پر گاڑھ لیں۔ اس نے ڈر ڈر کر نظریں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔ زبان سے البتہ ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ اس کے منہ پر جیسے کوئی قفل لگ گیا تھا۔

"جواب دو۔" اس نے ایک دفعہ پھر سے جھٹکا دیا۔ اس نے اپنی ہچکی روکنے کے لیے نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔ کچھ لمحے اس نے خود کو کمپوز کیا۔

"کوئی گناہ نہیں کیا میں نے جو آپ اس طرح بھڑک رہے ہیں۔ ہمیشہ آپ بلاوجہ ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں ہر بات میں آپ سے پوچھنے کی پابند نہیں ہوں۔" اس کی آنکھوں میں بنا خوف کے وہ دیکھنے لگی۔ وہ آگے سے ہنس دیا۔

"آپ کو پابند کبھی بنایا بھی نہیں میں نے۔ بنایا ہوتا تو اس دن بنا بتائے یوں گھر سے نہ نکل پڑتیں۔ لیکن میری پرسنل چیزوں میں گھسنے

کا کونسا جواز بنتا ہے مس ہائمہ ؟ کس نے آپ کو اتنا حق دیا ہے ؟"

آپ ؟...وہ پھر سے آپ ہو گئی تھی۔

حق ؟... کونسا حق ؟اس نے تو کبھی اتنا حق دیا ہی نہیں تھا۔

لیکن اس بات پر اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں فوراً پانی بھر آیا۔ ان میں لال ڈوریاں نمودار ہونے لگیں۔

اسے لگا ان کے درمیان سب کچھ ٹھیک ہونے لگا تھا۔ مگر وہ غلط تھی۔ وہ ایک ایسے انسان سے امیدیں وابستہ کر بیٹھی جس کے اندر اب دل نہیں پایا جاتا تھا۔ یا شاید اس کے لیے نہیں تھا۔

آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اس نے اپنے بازو چھڑوانے چاہے۔ لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ایک خفاسی نظر اس پر ڈالی تو وہ ہوش میں آیا۔ دھیرے سے اس کے بازو اپنی گرفت سے آزاد کیے۔

وہ پھر رکی نہیں۔ اپنی ہچکی روکتے ہوئے وہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی۔

پیچھے اس نے سر جھٹکا۔ پھر سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

اسے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ دل کے اندر ایک ملال سا ہونے لگا۔ اسے ناراض کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن غصے میں انسان وہ سب بھی بول جاتا ہے، جو وہ کہنا نہیں چاہتا۔

کافی دیر تک وہ اس کھلے دروازے کے پار دیکھتا رہا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

کچھ دیر وہ یونہی موبائل لے کر بیٹھا رہا۔ رات کو سحری تک وہ کام کرتا تھا۔ ایک بڑے سے مگ میں قہوہ بھر کر وہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مگر اس وقت کام کرنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے تو ہائمہ قہوہ بنا کر دے دیتی تھی۔ لیکن اسے پتا تھا، کم از کم آج کی رات اس نے شکل نہیں دکھانی تھی۔ سو وہ خود ہی کچن میں چلا آیا۔ قہوہ بنا کر اس نے دو مگ بھرے۔

اس کے کمرے تک آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر آیا، ہائمہ وہاں نہیں تھی۔ واشروم تک گیا۔ وہ بھی خالی تھا۔ پھر اسے پورے گھر میں ڈھونڈا۔ وہ نہیں ملی۔ اس نے بے اختیار اپنا ماتھا ٹیک لیا۔

وہ شاید واقعی ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن اس وقت گئی کہاں؟

اس نے فوراً وہ کپ وہیں لونگ روم میں ٹیبل پر رکھے۔ اور چابی لے کر باہر بھاگا۔ مین گیٹ کھول کر وہ باہر آیا۔ گھر کے قریب اس پارک میں۔ جو ان کی گلی کے آخری سرے پر تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

ایک کونے میں پڑے بینچ پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہاں سے اس کا ٹی پنک سکارف ہلکی ہوا سے پھڑ پھڑاتا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اس کے قریب آیا۔ اس کی پر شکوہ نظریں آسمان میں موجود اس گول چاند پر مرکوز تھیں۔ دونوں ہاتھ سینے سے باندھے وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ اتنی کہ اس کے آنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

وہ اس وقت شدید قسم کے پچھتاوں میں گھری ہوئی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔ اس دن کو لے کر جب اس نے آحل سے بات کرنے سے انکار کیا تھا۔ شادی سے پہلے۔ اگر وہ بات کر لیتی تو شاید یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ دونوں پہلے ہی آپس میں سب کچھ طے کر لیتے۔ ایسے کھوکھلے رشتے سے تو نہ ہونا ہی بہتر تھا۔ جس میں وہ دونوں اجنبیوں جیسی زندگی گزار رہے تھے۔

مگر شادی سے پہلے وہ اس رشتے کی پیچیدگیوں کو نہیں جانتی تھی۔ اسے تو بس اپنی ویلیوز عزیز تھیں۔ یا شاید انا؟

کم از کم اسے یہ اپنی انا ہی لگ رہی تھی۔ اسے اپنا آپ ہی قصوروار نظر آ رہا تھا۔ کیا تھا اگر ایک دفعہ بات کر کے مسئلہ حل کر لیا جاتا۔ اتنی اجازت تو اسلام نے بھی دے رکھی تھی۔

کبھی کبھی ہمیں اپنے فیصلے بہترین لگتے ہیں۔ دنیا چاہے لاکھ دفعہ بھی وارن کرے، ہم نہیں مانتے۔ بس اپنی بات پر ڈٹ جاتے ہیں۔ اور پھر وقت آنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم غلط تھے۔ پھر پچھتاوں کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

اسے بھی آبشار اور سماویہ نے بولا تھا، سمجھایا تھا کہ بات کر لے مگر اس نے صرف اپنے دل کی سنی۔ اب... اس کے پچھتانے کا دور

شروع ہو چکا تھا۔

وہ چپ چاپ بینچ کی دوسری طرف جا کر بیٹھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ وہ شاید ڈر گئی تھی، ابھی اٹھنے ہی لگی تھی کہ اس کی آواز آئی۔

"قسم کھا رکھی ہے مجھے ڈرانے کی؟" اس کی طرف چہرہ موڑا۔ "پورے گھر میں ڈھونڈ کر آ رہا ہوں یار۔ یہ کوئی وقت ہے یہاں بیٹھنے کا؟" وہ چپ رہی۔ منہ دوسری سمت موڑ کر وہ دوبارہ آسمان کو دیکھنے لگی۔

"چلو مانا کہ ناراض ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ..."

"کس نے کہا میں ناراض ہوں؟" اس نے جانچتی نظریں اس کی طرف موڑیں۔ "ناراض ہونے کا کوئی جواز بنتا ہے؟... ناراض وہاں ہوا جاتا ہے جہاں کوئی امید یا توقعات ہوں۔ جہاں حقوق و فرائض ہوں۔" اس نے منہ پھر سے سامنے کر لیا۔ "میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی آپ سے؟ یہاں تو میں اس لیے آئی ہوں کیوں کہ گھر میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اکثر آتی ہوں یہاں۔ اس میں ڈرنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ اور فکر نہ کریں... میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والی۔ آپ کی عزت کا خیال ہے مجھے۔" وہ مسکرائی۔

"اور یقین کیجیے، آحل اسفندیار خان!... ہائمہ یوسفزئی ایک بہادر لڑکی ہے۔ آدھی رات کو بھی اس کے لیے باہر نکلنا خطرے کی بات نہیں۔ وہ اپنے ہتھیار لے کر گھومتی ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ اس میں ایک ٹارچ تھا... یا شاید... کوئی سیکیورٹی گیجٹ۔ "سو مسٹر، مجھے کسی کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔" وہ بس ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ پل یونہی بیت گئے۔

"تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے؟" وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر لگے زخم کو دیکھ رہا تھا۔

"کس حق سے پوچھنا چاہ رہے ہیں آپ؟" اس کی آواز سرد تھی۔ اس نرم ٹھنڈی ہوا کی طرح نہیں، سرد آگ کی طرح۔

اس نے لب سختی سے آپس میں پیوست کر لیے۔ وہ اس کے الفاظ واپس اسی کو لوٹا رہی تھی۔

"گھر چلو۔ سحری کا وقت ہونے والا ہے۔" وہ اٹھا۔

"میرا کوئی موڈ نہیں اس وقت سحری کرنے کا۔"

"میرا تو ہے۔" وہ چپ رہی۔ "اچھا میں بنا لونگا سحری۔ اب چلو۔" وہ اب بھی ایسے ہی بیٹھی رہی۔ وہ نفی میں سر ہلاتا واپس آ بیٹھا۔ ٹھوڑی تلے ہاتھ جمائے وہ چاند کو دیکھ رہی تھی، جو بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔

وہ بھی وہیں بیٹھا رہا۔ ایسے ہی قریبا آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ خاموشی میں۔ وہ دونوں بینچ کے مخالف کونوں پر بیٹھے رہے۔ مشرق اور مغرب کی طرح۔ اپنی سوچوں میں گم۔

"ایک بات بولوں؟" شروعات اسی کو کرنی تھی۔ اس نے نگاہیں موڑ کر دیکھا۔

"دوستی کرو گی مجھ سے؟" اس کی دائیں ہتھیلی اپنی طرف پھیلی ہوئی دیکھ کر... اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔

مگر دل کی ہر بار نہیں سننی چاہیئے۔ اس نے بھی نہیں سنی۔ اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

جہاں صرف ایک نرم تاثر تھا۔

"دیکھو... دوستی اس دنیا کا سب سے خوبصورت رشتہ ہے۔ باقی ہر رشتے میں بناوٹ ہوتی ہے، دوستی میں نہیں۔ دوستی میں کسی کے راز جاننے کے لیے اجازت نہیں لی جاتی۔ کسی کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے حق نہیں پوچھا جاتا۔ دوستی میں کوئی فارمیلٹی نہیں ہوتی۔ بس بنا پوچھے، بنا بتائے ایک دوسرے کی ڈھال بنا جاتا ہے۔"

اُف... ظالم! ایسے وقت پر اتنی خوبصورت باتیں کرنے کے لیے تو اس کو کوئی سزا ملنی چاہیئے تھی۔ اس کا دل چاہا فوراً اس کی دوستی قبول کر لے، مگر... دل جائے بھاڑ میں۔ اس وقت اسے اپنی سیلف رسپیکٹ بچانی تھی۔

وہ مسکراہٹ دباتی ہوئی اپنا سکارف درست کر کے اٹھی۔ اس کا ہاتھ ایسے ہی پھیلا رہا۔ وہ حق دق سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کوئی جواب تو دو یار۔ پہلی دفعہ کسی کے سامنے اس طرح ہاتھ پھیلایا ہے۔" اس کی بے چاری شکل دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔

"سوچ کر بتاؤں گی۔" گردن کڑا کر اس نے کہا۔ اور پھر جانے لگی۔ وہ بھی نفی میں سر ہلاتا ہوا اٹھا اور اس کے پیچھے آیا۔ جانے اور کیا کیا کرنا پڑے گا اسے۔

"سحری آپ بنا ہے ہیں، یاد ہے نا آپ کو؟" اس نے مسکراہٹ دبائی۔ وہ جو چپ چاپ چل رہا تھا، رک کر ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر تیز تیز چلنے لگا۔ وہ سخت خفا لگ رہا تھا۔

اور اگر وہ سامنے نہ ہوتا تو اس کی ایسی شکل پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس رہی ہوتی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

"آحل۔ آپ اس دن کہہ رہے تھے کہ مجھے سماویہ کے بابا سے ملاؤ گے۔" وہ لونگ روم میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا جب سامنے بیٹھی ہائمہ نے اسے یاد کروایا۔

"فلحال مشکل ہو گا..." اس نے کوئی بہانہ بنانا چاہا۔ اس دن تو اس نے کہہ دیا تھا کہ ملوا دے گا۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہائمہ ان سے ملے۔ ان سے دونوں کا ماضی جڑا ہوا تھا۔

"اب کوئی مشکل نہیں ہو گی کیونکہ میں نے ان سے خود بات کی ہے۔" وہ چہک کر بولی۔

"کیا مطلب؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ اس دن گھر پر نہیں تھے۔" وہ حیران ہوا۔

"بلکل۔ لیکن وہ سماویہ کے بابا ہیں آحل۔ خونی رشتوں کو ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خون میں ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے۔ چاہے ایک دوسرے سے کتنے بھی ناراض کیوں نہ ہوں ان کے دل جڑے رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ میری آمد کی اطلاع انہیں کیسے ملی۔ مگر مجھے کل ان کی کال آئی تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا کہ انہوں نے خود مجھے کال کی ہے۔" وہ دھک سے رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی وکال انداہ سری تک خبر پہنچ چکی ہو گی۔

"سیریئسلی؟" اس نے آگے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ سماویہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اس کا ایڈریس اور نمبر مانگ رہے تھے۔ مگر میں نے نہیں دیا۔ پہلے ان سے خود ملنا چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کس حد تک اپنی بیٹی سے مخلص ہیں۔ اتنے عرصے تک اسے کیوں بھلائے بیٹھے تھے۔"

"شاید ان کی کوئی پرسنل پرابلمز ہوں۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "بہر حال، تم ان ملنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ لیکن اکیلی ملنے نہیں جاؤ گی، میں ساتھ چلوں گا۔"

اس کا جواب سن کر ہائمہ کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

اگلے دن دوپہر کا وقت ہو رہا تھا جب وہ دونوں بس پر میر دیکا سکوئیر پہنچے۔ یہاں سے انہیں دوسری بس لینی تھی۔ وہاں تک پیدل چل رہے تھے۔ اس نے جینز پر آدھے آستین والی سفید کھلی شرٹ اور سر پر پی کیپ پہن رکھی تھی۔ اس نے ٹی پنک سٹالر کے ساتھ سفید پاؤں کو چھوتی سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس پر چھوٹے چھوٹے ٹی پنک پھول بنے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک پرفیکٹ کپل لگ رہے تھے۔ وہ اس میچنگ کو سوچ کر مسکرائی۔ وہ آج بہت خوش اور ایکسائیٹڈ تھی۔

البتہ آحل کی شکل پر بارہ بجے ہوئے تھے۔ آج گرمی بہت زیادہ تھی جس کی باعث اسے روزہ بہت لگ رہا تھا۔ اور پھر بس میں آنا جانا، پیدل چلنا۔ اسے کافی عرصہ ہو گیا تھا یہ سب کرتے ہوئے۔

وہ سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا جب اس کے کندھے سے کوئی بہت زور سے ٹکرایا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، ایک لڑکی بھاگ کر بس کی طرف جاتے ہوئے اس سے ٹکرائی تھی۔

"ان خواتین کو بلکل تمیز نہیں ہوتی چلنے کی۔" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا۔

"بے چاری جلدی میں ہو گی نا۔ مگر آپ کو جانے کیا مسئلہ ہے خواتین سے۔ کبھی میر دیکا سٹاپ پر کوئی لڑکی ٹکرا جائے تو وہ غلط، کبھی مہوڈنڈ میں کسی لڑکی سے خود ٹکرا جائیں تو بھی وہ غلط۔ آپ خود..." اس نے دانتوں تلے زبان دبا دی۔ وہ مڑ کر اسے اچھنبے سے دیکھنے

لگا۔

"مہوڈنڈ؟" اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر چلنے لگی۔

"نہیں ایک منٹ۔" وہ اس کے پیچھے تیزی سے آیا۔ "تمہیں کیسے پتا کہ میں مہوڈنڈ... رکو۔ تم بھی وہاں تھی؟"

"میں وہی تھی جسے آپ نے اپنے گھوڑے سے ٹکر ماری۔ اوپر سے سنا بھی مجھے رہے تھے۔ ہونہہ! اتنا بھی کیا ایٹیٹیوڈ۔

مانا کہ گھوڑے پر بیٹھے آپ شہزادے لگ رہے تھے۔ لیکن اگر کوئی بھی بیٹھتا تو ایسا ہی لگتا۔ اور میں آپ کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ میں اس گھوڑے اور خوبصورت جگہ کو دیکھ رہی تھی۔" وہ تیز تیز چلتی ہوئی ایک ہی سانس میں بول رہی تھی۔ اسے آج تک وہ بے عزتی بھولتی نہیں تھی۔

اور وہ ناسمجھی سے اس کے ساتھ تیز تیز چلنے لگا۔ چونکہ بس نکلنے والی تھی۔

جلدی سے وہ دونوں بس میں چڑھے۔ آگے کی دو سیٹیں خالی تھیں۔ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

"سیریئسلی۔" آحل نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مجھے کیسے پتا نہیں چلا کہ وہ تم تھی؟" وہ ابھی تک شاک میں تھا۔

"کیونکہ میں نقاب میں تھی۔"

"اوہ۔ لیکن پھر ہماری شادی کیسے ہو گئی۔ ضرور تم مجھے جانتی ہو گی۔"

"مجھے تو آپ پسند ہی نہیں تھے، جب مجھے پتا چلا تو میں نے رشتے سے انکار تک کر دیا تھا۔ یہ تو ابو نے مجھے منایا رشتے کے لیے۔"

"کہیں تم نے مجھے پھنسانے کی کوئی پلیننگ تو نہیں کی تھی۔" وہ اپنی رو میں بولا جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اسے جان بوجھ کر تنگ رہا تھا۔ وہ ہنسنے لگی۔

"پھنسا تو میں آج تک نہیں پائی آپ کو۔"

"کون جانے؟" وہ عام سے انداز میں بولا اور پھر فون پر شروع ہو گیا۔ اس کی دھڑکن بے ساختہ بڑھی۔

اس بات کا کیا مطلب تھا؟ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر مسکرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ دل میں عجیب سی ہل چل مچا دیتا تھا یہ شخص۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

وکال انداہ سری نے ان کا استقبال بہت خوشنودی سے کیا تھا۔ انہوں نے آحل کو اس کے ساتھ دیکھا تو بہت حیران ہوئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آحل اسفندیار کی بیوی ہو گی۔

"آحل پترا؟" ان کی آواز میں خوشگوار سی حیرت تھی۔ آگے سے وہ انڈو میں باتیں کر رہے تھے جس کی اسے سمجھ نہیں آئی۔ لیکن ان دونوں کی آپس میں شناسائی صاف واضح تھی۔ جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

"یہ آپ کو کیسے جانتے ہیں۔" انہیں گیسٹ روم میں بٹھا کر وہ جب باہر گئے تو وہ اس کی طرف کھسکی۔ وہ آگے سے خاموش رہا تو اس نے ایک گھوری سے نوازا۔

"کیسی ہو بیٹی؟" وہ تھوڑی دیر بعد آ کر ان کے ساتھ بیٹھے۔ "اس دن کے لیے بہت معذرت چاہتا ہوں۔ میں گھر پر ہوتا تو..."

"اٹس اوکے انکل۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ کی بیوی کو سماویہ سے مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے دوسروں کی اولاد کوئی نہیں اپنانا چاہتا۔ لیکن... آپ نے اب تک اپنی بیٹی سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ کیا آپ کو اپنی بیٹی یاد نہیں تھی یا پھر... آپ کو اس سے کوئی انسیت ہی نہیں۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔ آحل نے اپنا پاؤں اس کے پاؤں پر مارا، اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ وکال انداہ سری کی آنکھوں میں پانی دیکھ کر وہ دھیمی ہوئی۔

"ایسی بات نہیں ہے بیٹی۔ وہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جس دن سے وہ مجھے چھوڑ کر گئی ہے۔ میں ایک دن بھی سکون سے نہیں بیٹھا۔ بہت کوشش کی اس سے ملنے کی، اسے ڈھونڈنے کی۔ کچھ سال تو رینا نے اسے بہت چھپایا۔ لیکن جب مجھے اس کا پتہ معلوم ہوا تو میں

سیدھا یہاں سے پاکستان گیا۔ آپ لوگوں کے گھر، آپ کے والد سے ملا، میں نے ان کی بہت منتیں کیں۔ لیکن رینا نے میرے خلاف ان کے ذہن میں اتنا زہر بھرا ہوا تھا کہ انہوں نے سماویہ کو میرے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔" انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"کیا واقعی؟" وہ بہت حیران ہوئی تھی۔ اسے ایسا کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ انہوں نے آگے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"کسی نے مجھے اپنی بیٹی سے ملنے نہیں دیا۔ اور پھر... میں نے بھی ضد نہیں کی، میں نے سوچا جہاں میری بیٹی کی خوشی ہو۔ آپ کے گھر میں اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا، میں یہی سوچ کر خوش ہو گیا تھا۔ لیکن جاتے ہوئے میں نے رینا کو اپنا اکاؤنٹ نمبر دیا۔ میں ہر ماہ سماویہ کا خرچہ بھیجتا رہا۔ اکثر رینا سے اس کا حال پوچھا کرتا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ سماویہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ پھر بھی آپ کہہ رہی ہو کہ مجھے اپنی بیٹی کا خیال نہیں؟"

"آئی ایم سوری۔ مجھے ایسا کچھ معلوم نہیں تھا۔ نہ ہی سماویہ کو ان باتوں کی خبر ہے۔ وہ خود ہمیشہ سے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر پھپھو تو کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔" اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سچا کون تھا۔

"ایسی عورت کی باتوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے جو دوسروں کا گھر برباد کرتی ہو۔" آحل کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے تھے۔ اور جب اس نے مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا تو وہ چپ ہو گیا۔ ملازم ٹرالی گھسیٹ کر اندر لایا۔ اور انہیں چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات پروسنے لگا۔

"کہنا کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں۔" وہ بس اتنا بول کر ان سے بات کرنے لگا۔

"آپ چائے لیں گی یا کافی۔" انہوں نے اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نتھنگ۔" اس نے اپنے نقاب کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "مجھے صرف کچھ سوالوں کے جواب چاہیئں۔ لیکن آپ کی باتوں نے مجھے مزید الجھن میں ڈال دیا ہے۔ پھپھو نے کبھی بھی آپ کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کیا۔ مگر آپ کی باتیں کچھ

اور ہی ظاہر کرتی ہیں۔ اور... آپ آحل کو کیسے جانتے ہیں۔"

"یہ سب سمجھنے کے لیے آپ کو کچھ برس پیچھے جانا ہو گا۔" انہوں نے آحل کو دیکھ کر کہا۔ اور پھر جیسے وہ اپنے ماضی میں چلے گئے تھے۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

یہ تب کی بات تھی جب وکال انداہ سری کا یونی ورسٹی میں چوتھا سمسٹر تھا۔ اسفندیار خان پاکستان سے ایکسچینج سٹوڈینٹ کے طور پر انڈونیشیا آیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ ان کی اسفندیار خان سے دوستی وہیں ہوئی تھی۔

اسفندیار ایک خوبرو اور ہونہار لڑکا تھا۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا جب اس کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ماں باپ نے خاندان سے چھپ کر شادی کی تھی، اور ان کی وفات کے بعد اس کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا جو اسے اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہوتا۔ ایسے میں اس کے والد کے دوست محمد گل آفریدی نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور اپنے بیٹوں کی طرح اس کی پرورش کی۔ اسے پڑھایا لکھایا۔ اس کی تمام ضروریات پوری کرتے۔

ان کے بیٹے بھی اسے اپنے بھائیوں کی طرح مانتے تھے۔ اور اس پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی، آصفہ آفریدی۔ جس کا رشتہ بچپن میں ہی اس سے طے ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت اور باکردار لڑکی تھی۔ جب بھی وہ اس کا ذکر کرتا تو مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں پر آجاتی تھی۔ وہ بہت خوش تھا اس رشتے سے۔ آئے دن آصفہ کے لیے تحائف بھیجا کرتا۔ اس کی ڈگری ختم ہوتے ہی ان کی شادی ہو جانی تھی۔

لیکن پھر... اس کی محبت کو شاید کسی کی بری نظر لگ گئی کہ امبرین یوسفزئی جیسی عورت نے اس کی زندگی میں قدم رکھا۔ وہ ان سے ایک سال جونیئر تھی۔ وہ بھی ایکسچینج سٹوڈینٹ کے طور پر پاکستان سے آئی تھی۔ اس نے جانے اسفندیار کو کہاں دیکھا تھا۔ دیکھتے ساتھ ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

وہ بہت شوخ مزاج لڑکی تھی۔ فیشن، دوستیاں، پارٹیاں اور اسفندیار خان۔ یہ اس کی پسندیدہ چیزیں تھیں۔ وہ ہمیشہ اسفندیار کے

آگے پیچھے گھومتی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ دوستی بھی کر لی۔ اور بے چارہ وکال انداہ سری... جو اسفندیار کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ اس شوخ لڑکی سے محبت کر بیٹھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اسے اسفندیار پسند تھا۔ اسے اس بات کی تسلی تھی کہ اسفندیار منگنی شدہ تھا۔ آج نہیں تو کل، امبرین کو اسی کے پاس آنا ہو گا۔

جب ان کی ڈگری ختم ہوئی تو اسفندیار وہیں ایک ایمبیسی میں جاب مل گئی تھی۔ امبرین نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا، اور التجا کی کہ آصفہ کو چھوڑ کر اس سے شادی کر لے۔ مگر اس نے اس کی بات کو مزاق میں ٹال دیا۔ وہ اپنی سالوں کی محبت کو صرف اس لیے چھوڑ دیتا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ کبھی نہیں۔

پھر وہ پاکستان چلا گیا۔ اور شادی کر کے آصفہ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ محمد گل نے اسے پاکستان میں رہنے کا کہا لیکن وہ ان کا مزید احسان نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو کر اپنی فیملی کی ذمہ داری لینا چاہتا تھا۔ وہ اور آصفہ ایک آئیڈیل کپل تھے۔ بھروسہ، محبت، مان ان کے درمیان یہ سب کچھ تھا۔

امبرین ابھی یونی ورسٹی میں ہی تھی، کچھ عرصہ ناراضگی کے بعد وہ پھر سے ان کے ساتھ ٹھیک ہو گئی۔ اس نے اسفندیار کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ آصفہ کو اس کی پسندیدگی کا علم تھا، لیکن وہ عقل مند لڑکی تھی۔ اس نے کبھی بھی اس بات کو مسئلہ نہیں بنایا۔

جیسے وکال اور باقی سب اسفندیار کے دوست تھے، وہ اسے بھی انہیں کی طرح سمجھتی۔ اور پھر ان کا رشتہ بہت مضبوط تھا، کسی شک کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک سال بعد ان کے گھر آحل اسفندیار خان نے جنم لیا۔ اس چھوٹے سے بچے نے ان کے گھر کو مزید خوشیوں سے بھر دیا تھا۔ آصفہ نے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود کوئی جاب نہیں کی۔ وہ اپنا سارا وقت آحل اور گھر کو دیا کرتی۔ اسفندیار بھی آفس کے بعد گھر پر ہی ہوتا۔ وہ چھوٹی سی فیملی بہت خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔

اور یہ سب دیکھ کر امبرین نے بھی موو آن کرنے کا سوچ لیا۔ اس نے وکال سے شادی کر لی۔ وکال کو اپنی محبت مل گئی تھی، اس کی تو خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ دنیا بھر کی خوشیاں اس کی جھولی میں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ اس کی ہر خواہش کہنے سے پہلے

پوری کرتا تھا۔ ان کے گھر میں ساویہ نے جنم لیا تو امبرین بہت خوش تھی۔ وہ اسفندیار کی محبت کو بھول بھال گئی تھی۔ وکال کی محبت اور اس کی ننھی پری نے اس کا دامن خوشیوں سے بھر دیا تھا۔ مگر اس کی وکال کے گھر والوں سے بنتی نہیں تھی، وہ اکیلا گھر چاہتی تھی۔ جو اس نے لے کر بھی دیا۔ کچھ عرصہ وہ الگ گھر پر راج کرتی رہی۔

لیکن پھر وکال کی ماں بہت بیمار رہنے لگی۔ انہیں مجبوراً واپس ان سب کے ساتھ رہنا پڑا۔ وکال کی ماں ایک شریف خاتون تھیں۔ مگر امبرین سے وہ برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ نہ اس سے وکال کے بہن بھائی برداشت ہوتے۔ چھوٹی موٹی باتوں پر تماشہ لگانا آہستہ آہستہ اس کا مشغلہ بنتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس محل پر وہ اکیلی راج کرتی۔ مگر وکال اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو اس کی خاطر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ امبرین نے اس سے طلاق لینے کی بات کی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

اسے بہت محبت سے سمجھایا۔ اور اسے پھر سے الگ گھر لے گیا۔ لیکن اس کا دل اس شادی سے بھر اگیا تھا۔ وہ ہر صورت طلاق چاہتی تھی۔ اور اس کے بہت مجبور کرنے پر اس نے طلاق بھی دے دی۔ وہ ساویہ کو زبردستی اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے زیادہ زور نہیں دیا چونکہ ابھی وہ چھوٹی تھی، ماں کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ اسے حق مہر کے طور پر وہ گھر اور بہت کچھ دیا۔ اب وہ وہیں اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔

اس نے اسفندیار کے گھر پھر سے آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کی محبت پھر سے جاگ اٹھی تھی۔ وہ اسفندیار کو پانا چاہتی تھی۔ لیکن اس دفعہ اس نے اسفندیار سے کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے سیدھی طرح کبھی بھی شادی نہیں کرنے والا۔ سو اس نے گھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کر دی۔ نئے چال بنانے شروع کر دیے۔

اس نے کافی دفعہ اسفندیار کو آصفہ سے بدزن کرنا چاہا۔ کبھی اس پر بدکردار کا الزام لگاتی۔ کبھی چوری کا۔ لیکن وہ اسے اگنور کر دیتا۔ اسے اپنی بیوی کے مقابلے میں ایک غیر عورت پر بھروسہ نہیں تھا۔ نہ اس نے کبھی آصفہ سے ایسی کوئی بات کی۔ آصفہ کا امبرین سے بہت اچھا تعلق تھا، دوستوں کی طرح۔ اسے تو اس بے چاری پر ترس آتا تھا جسے شادی کے کچھ ہی سالوں میں طلاق ہو گئی تھی۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ بے چاری ناگن اسے ہی ڈسنے والی تھی۔ وہ ناگن اتنے وقت سے اس کے گھر کی خوشیوں پر نظر رکھے بیٹھی تھی۔ اور جب اسے موقع ملا۔ اس نے ڈس بھی لیا۔

اسفندیار کا ایک آفس ورکر تھا۔ وہ اکثر ان کے گھر آیا جایا کرتا۔ اسفندیار آفس ہوتا تو آحل کو سکول سے لے آتا۔ یا گھر کا راشن لے آتا۔ آصفہ باقی سب کی طرح اسے بھی بھائی سمجھ کر اس کی خاطر کیا کرتی۔ امبرین ایک دن ان کے گھر آئی تو وہ بھی وہیں تھا۔ آصفہ کے کمرے کی وائرنگ خراب ہو گئی تھی جسے وہ ٹھیک کر رہا تھا۔ اسفندیار کے آنے کا وقت تھا۔ اس نے چپکے سے ان دونوں کے پیچھے کمرہ لاک کر دیا۔ اندھیر کمرے میں وہ بھولی عورت اس غیر آدمی کے ساتھ کھڑی یہ نہیں جانتی تھی کہ اس پر کونسا پہاڑ ٹوٹنے والا تھا۔

اسفندیار کے ذہن میں امبرین نے پہلے سے ذہر بھرا ہوا تھا۔ کچھ دروازہ کھولنے پر ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے آصفہ سے بہت سوال جواب کیے۔ وہ رو رو کر اپنے حق میں صفائیاں پیش کرتی رہی۔ اس وقت اسفندیار نے بہت مشکل سے خود کو قابو کیا۔ لیکن اس کے دل میں آصفہ کے لیے شک پیدا ہو گیا تھا۔

امبرین نے اس ورکر کو پیسے دے کر خرید لیا، اس نے اپنے اور آصفہ کے گناہ کی گواہی دی۔ اور جھوٹے ثبوت بنا کر اسفندیار کے سامنے پیش کیے۔ اور ایک دفعہ پھر سے اسے ٹریپ کیا۔ اسفندیار خان کے لیے اب اور برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے آصفہ کو کہا کہ اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرے۔ اور اس بے چاری کا تو دل کرچی کرچی ہو گیا۔

وہ اس سے ثبوت مانگ رہا تھا؟؟

کیا اتنے سالوں کی محبت اور وفا کا یہ صلہ تھا؟؟

کہاں گیا اس کا مان اور بھروسہ؟؟

اگر اسے بھروسہ ہی نہیں تھا تو وہ لاکھ ثبوت پیش کر دیتی، وہ یقین نہ کرتا۔ اور اتنی غیرت تو اس میں بھی تھی کہ اس کے ساتھ اور بھروسے کی بھیک نہیں مانگ سکتی تھی۔ اس نے بھی کہہ دیا کہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ اسی شام اس نے آصفہ کو طلاق دے دی۔ پھر وہ بھی اس کے گھر نہیں رکی۔ آنسو بہاتی آحل اور آیت کو اپنے ساتھ لے کر وہ گھر سے نکل رہی تھی کہ اسفندیار نے اس کا راستہ روک لیا۔

"تم میرے بچوں کو لے کر کہیں نہیں جا سکتی۔"

"یہ میرے بچے ہیں۔" اس نے آیت کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ روتے ہوئے آحل کو اپنے ساتھ لگایا۔

"یہ میرا خون ہے آصفہ۔ میں انہیں کہیں نہیں جانے دونگا۔" اس نے آحل کو بازو سے کھینچ کر اپنی طرف کیا۔ وہ دوبارہ ماں سے لپٹ کر رونے لگا۔

ان کا شور سن کر، پڑوسن کمالہ بھاگتی ہوئی آئی۔ وہاں کی صورتحال دیکھ کر اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس نے فوراً اپنے شوہر، محمد کو بلایا۔ انہوں نے دونوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ دونوں اپنی ضد پر اڑے رہے۔ کوئی بھی بچوں کو چھوڑنے پر راضی نہیں تھا۔

"اب صرف ایک ہی حل ہے۔ تم دونوں ایک ایک بچے کو اپنے ساتھ رکھ لو۔ ورنہ ان بچوں کی زندگی خراب ہو گی۔" انہوں نے پیشکس کی تو آصفہ بہت چلائی، روئی۔ وہ کسی کو بھی چھوڑنے پر راضی نہیں تھی۔

"آحل لڑکا ہے، اور بڑا ہے۔ اسے باپ کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ آیت بیٹی تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم آحل کو اپنے ساتھ رکھ لو۔ آیت کو بھابھی کے ساتھ جانے دو۔" محمد نے مشورہ پیش کیا۔ آحل نے سنا تو وہ ماں سے چپک گیا۔ اس دن اسے محمد عارفین پر بہت غصہ آیا تھا۔ ان کی وجہ سے وہ اپنی ماں سے الگ ہو گیا۔

ایک آدھ گھنٹہ رونے دھونے کے بعد آصفہ بھی مان گئی۔ کمالہ نے اسے بہت سمجھایا۔ وہ ایک ہی بچے کو اپنے ساتھ لے کر جا سکتی تھی۔ آیت بہت چھوٹی تھی، اسے وہ چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ سو آحل کو ہی چھوڑنا پڑا۔ اس کو گلے لگا کر وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ اسفندیار نے پاکستان کے لیے اس کا ٹکٹ بک کروایا۔

اور پھر وہ چلی گئی۔ ہمیشہ کے لیے۔ آحل گھر کی دہلیز پر بیٹھا ماں کے پیچھے گھنٹوں روتا رہا۔

امبرین کے دل کو جیسے ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ اس نے اسفندیار کو جا کر دلاسے دیے۔ مگر اس کا غم اتنا بڑا تھا کہ کسی کی تسلیوں سے پر

نہیں ہونے والا تھا۔ اس نے امبرین پر اس وقت بھی دیہاں نہیں دیا۔ اسی دوران امبرین کو ایک آدمی نے شادی کے لیے پروپوز کر دیا۔

امبرین نے اسفندیار اور داؤد کا کا موازنہ کیا تو داؤد کئی بہتر لگا۔ وہ بہت امیر تھا۔ اور اسے پسند بھی کرتا تھا۔ اسفندیار اس کے سامنے زیرو تھا۔ سو اس نے داؤد سے منگنی کر ڈالی۔ مگر پھر اس سے بھی منگنی توڑ کر وہ سماویہ کے ساتھ پاکستان چلی گئی۔

اسے آزادی پسند تھی، اور کسی مرد کے ساتھ رہ کر اسے وہ آزادی کبھی نہیں مل سکتی تھی۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

وہ جیسے کسی ٹرانس سے نکلی تھی۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھپھو ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟" یک دم کھڑی ہوئی۔ "آپ خود کو اچھا ظاہر کرنے کے لیے میری پھپھو پر اتنے بڑے الزام کیسے لگا سکتے ہیں؟" اس کی پھٹی ہوئی آواز اس ڈرائنگ روم میں گونجی۔ اس نے آحل کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"بیٹی، میں نے صرف سچائی بیان کی ہے۔ کسی پر الزام لگا کر کیا مجھے وصول ہو گا۔ میری بیٹی واپس تو نہیں مل جائے گی۔"

"آپ نے اپنی بیٹی کے بارے میں بات کی ہی کب ہے؟ میں یہاں اس لیے آئی تھی کہ سماویہ اور آپ کو ملوا سکوں، اس لیے نہیں کہ آپ میرے سامنے میری ہی پھپھو کی برائیاں کریں۔ اور آپ کو کیا لگتا ہے میں اسے اس کی ماں کے بارے میں یہ سب بتاؤں گی؟" وہ آگے سے نفی میں سر ہلانے لگے۔

"میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔ مجھے صرف اپنی بیٹی کی خوشی عزیز ہے۔"

"بیٹھ جاؤ ہائمہ۔ وہ صرف سچائی بیان کر رہے ہیں۔ سچ بے شک کڑوا ہو لیکن سچ ہوتا ہے۔ اسے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ سماویہ کو بھی قبول کرنا ہو گا۔" آحل اٹھ کر بولا۔ تو وہ آگے سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں۔ میں اب یہاں نہیں رکوں گی۔ نہ ہی سماویہ کو آپ سے کوئی رابطہ کرنے دونگی۔ چلیں آحل۔" وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے وہاں سے نکلی۔

"سوری۔ وہ تھوڑی جذباتی ہے۔" آحل انہیں دیکھ کر شرمندگی سے بولا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ کسی اپنے کے بارے میں یہ سب سننا آسان نہیں ہوتا۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے آگے سے سر ہلایا۔

"اسے شاک لگا ہے۔ لیکن آپ پریشان مت ہوں۔ وہ خود ہی آپ کو آپ کی بیٹی سے ملوائے گی۔ جانتے ہیں... وہ بلکل ایشا کی طرح دکھتی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"کیا واقعی؟" ان کی آنکھوں میں تارے جھلملانے لگے۔ "تمہارے پاس کوئی تصویر ہو گی؟"

"نہیں۔ مگر آپ اس سے جلد ملاقات کریں گے۔ وعدہ۔" اس نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دبائے۔ وہ آگے سے مسکرا دیے۔

"چلو جاؤ۔ تمہاری بیوی انتظار کر رہی ہو گی۔"

"اللہ حافظ۔" ان سے بغل گیر ہو کر وہ باہر نکل آیا۔

وہ ان کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ وہ قریب آیا تو اس کی سوں سوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ شاید رو رہی تھی۔ اس کے آتے ہی وہ ٹیکسی سٹاپ کی طرف چلنے لگی۔ وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"رو کیوں رہی ہو؟" اس نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔

سٹاپ پر آکر اس نے ٹیکسی رکوائی۔ وہ چپ چاپ پیچھے بیٹھ گئی۔ راستے میں وہ بھاگتی ہوئی عمارتوں کو دیکھتی رہی۔

پھپھو اتنی بری بھی ہو سکتی تھیں؟ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ہاں امی کے ساتھ ان کی تھوڑی بہت تکرار شروع سے رہی

تھی۔ مگر اس کے ساتھ تو وہ بہت اچھی تھیں۔ ہمیشہ اس کے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آتی تھیں۔ اسے یاد تھا، بچپن میں کبھی امی غصہ کرتیں تو وہ اس کی خاطر ان سے لڑ پڑتی تھیں۔ اور پھر ان سے خونی رشتہ تھا، ایک ہی گھر میں ان کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ان سے محبت کرتی تھی۔

آج اسے لگا جیسے ایک دم سے کسی نے آکر ان کے خاکے پر کالک مل دی تھی۔ وہ اس کالک کو مٹانا چاہتی تھی۔ لیکن مٹا نہیں پا رہی تھی۔

ٹیکسی رکی تو اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک ریسٹورانٹ کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ پھر آحل کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ مجھے گھر جانا ہے۔" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"گھر بھی چلے جائیں گے۔ ابھی آؤ۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اندر جانے لگا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک دفعہ پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ریسپشن پر افطار کا آرڈر دے کر وہ اسے فیملی ایریا میں لایا۔

"تم نقاب اتار سکتی ہو۔ یہاں فی میل ویٹرز ہیں۔" اس نے ٹیبل پر پڑے ٹشو باکس کو اس کے سامنے کیا۔ اس نے ایک دو ٹشو نکال کر اپنا نقاب اتارا اور چہرہ صاف کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بولی تو آواز صاف تھی۔ آنکھیں پھر بھی گلابی ہو رہی تھیں۔

"آپ کی ڈائری میں جورینا ہے۔ وہ پھپھو تھیں، ہے ناں؟" اس نے آگے سے کڑوی سی شکل بنائی۔

"ایک تو تمہیں میری جاسوسی کرنے سے بہت خوشی ملتی ہے۔ کیا ضرورت تھی میری ڈائری پڑھنے کی۔ کسی کی پرسنل چیزیں پڑھنا ایتھکس کے خلاف ہوتا ہے۔"

"آپ نے مجھے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا۔ کسی نے بھی مجھے پھپھو کی اصلیت نہیں بتائی۔" اس کی بات کو اگنور کرتے ہوئے اس نے شکوہ کیا۔

"کیا بتاتا؟ کہ تمہاری پھپھو کتنی ولن ٹائپ ہیں۔ یا انہوں نے میری ماں کے ساتھ کیا کیا... اس سے میرا کیا فائدہ ہوتا؟ اور... اب اپنی حالت دیکھو۔" اس نے اس کے آنسوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ "اسی لیے نہیں بتانا چاہتا تھا۔" ٹیبل پر پڑے گلاب اور خوشبودار موم بتیوں کی خوشبو اسے اپنے اندر تک گھلتی محسوس ہوئی تھی۔

"مجھے امپریس کرنے کا موقع چاہیئے بس آپ کو۔" وہ گیلی آنکھوں سے ہنستے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ "لیکن سوری، میں اتنی جلدی امپریس نہیں ہوتی۔" اس نے کندھے اچکائے تو وہ آگے سے ہنس دیا۔

"میں سماویہ کو کیا بولوں گی؟ میں نے تو پھر بھی برداشت کر لیا۔ لیکن وہ اس کی ماں ہیں۔ وہ یقین نہیں کرے گی۔ اور فرض کریں وہ واقعی یقین کر لیتی ہے۔ پھر... وہ اپنی ماں کو بھی کھو دیگی۔ باپ کی محبت اسے کبھی نہیں ملی، اب ماں کو بھی کھو دے؟"

"اسے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو کیا اسے اسی جھوٹ میں جینے دوں؟ پھپھو ہمیشہ سے یہی کہتی آئی ہیں کہ وکال انکل برے ہیں۔ اور انہوں نے خود اسے اور پھپھو کو چھوڑا تھا۔ مگر کیا وہ اپنے بابا سے مل کر سچائی نہیں پوچھے گی؟ ماں باپ میں سے ایک کو تو اس کی نظروں میں برا بننا ہی پڑے گا۔"

"ہائمہ۔ ایک ہوتا ہے جھوٹ۔ دوسرا ہوتا ہے سچائی چھپانا۔ جھوٹ بولنا غلط بات ہے، سچائی چھپانا نہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ جھوٹ بولیں، جھوٹ نہ بولتے ہوئے بھی آپ سچائی کو چھپا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس میں کسی کا بھلا ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ "سماویہ کی نظروں میں اس کی ماں کا امیج برقرار رکھتے ہوئے بھی تم اس کا اور اس کے بابا کا اچھا تعلق بنا سکتی ہو۔"

وہ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ وہ اس عورت کے بارے میں بات کر رہا تھا جس نے اس کا بچپن برباد کیا تھا۔

"آپ ان سے کوئی بدلہ نہیں لینا چاہتے؟ جو کچھ انہوں نے آپ کی فیملی کے ساتھ کیا..."

"میں اس سب سے بہت آگے نکل آیا ہوں ہائمہ۔ وہ سب ماضی تھا، اب میں اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ہوں۔ امے خوش ہیں۔ وہ بابا کو معاف کر چکی ہیں۔ بابا کی روح بھی سکون میں ہو گی۔ اس سے زیادہ مجھے کیا چاہیئے؟" وہ مسکرایا۔ "ہاں میں انہیں معاف نہیں کر سکتا لیکن... مجھے اب ان سے کوئی بدلہ نہیں چاہیئے۔ میں نے یہ معاملہ بہت پہلے اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔"

افطار کا وقت قریب تھا۔ ویٹر آ کر مختلف کھانوں سے ٹیبل سجانے لگی۔ پھولوں اور موم بتیوں میں لذیذ کھانے کی خوشبو بھی شامل ہونے لگی تھی۔

اس نے اپنے سامنے بیٹھے پر سکون چہرے والے اس شخص کو دیکھا۔ وہ ہو بہو وہی شخص تھا جیسا وہ کبھی اپنے لیے خدا سے مانگا کرتی تھی۔ وہ اپنے خدا کا شکر ادا کرتی بھی تو کن الفاظ میں؟ اس نے ہمیشہ بہترین سے نوازا تھا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

چاند رات کو وہ جب کچن سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو ایک لمحے کے لیے کچھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کر کے اس کے قریب آئی۔ بیڈ پر رکھا وہ باکس بلکل آحل کے باکس کی طرح تھا۔ لیکن اس کا رنگ سفید تھا۔ اور کنارے سنہری۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر اس ڈبے کو ہاتھ میں اٹھایا۔ اور اس کا جائزہ لیا۔ اس کے اندر کیا تھا؟ اور اس کے کمرے میں کیوں رکھا تھا؟ وہ حیران تھی۔ اتنا تو اندازہ تھا کہ آحل نے خود ہی رکھا تھا۔

اب اس کا پاسورڈ کھولنے میں جانے کتنے دن لگ جائیں۔ اف۔ اس نے جان بوجھ کر اسے ستانے کے لیے یہ رکھا تھا۔ اسے شاید مزہ آتا تھا اسے تنگ کرنے میں۔

باکس کو سامنے کر کے اس کا پاسورڈ والا حصہ دیکھا تو اس کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ وہاں ایک چٹ لگی ہوئی تھی۔

'پاسورڈ لگاتا تو شاید تم اگلے سال تک اسے کھول پاتی۔'

اس نے مسکرا کر سر جھٹکا اور پھر اس چٹ کو اتارا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک دم بڑھ گئی تھی۔ جانے اس کے اندر کیا تھا؟ عین اس چٹ کے پیچھے ایک بٹن تھا، اس نے دبایا تو ایک کلک سے وہ کھل گیا۔ اس کا اوپری حصہ اٹھایا۔ وہاں ایک چٹ تھی۔

'میری سب سے اچھی دوست کے لیے۔'

یہ الفاظ پڑھ کر وہ مبہوت رہ گئی۔ نچلے حصے میں ایک باکس تھا، اس کے اوپر بھی چٹ تھی۔

'تمہارا عید کا تحفہ۔'

اف۔ آج وہ واقعی اسے حیران کر رہا تھا۔ وہ چٹ اتار کر اس نے ایک طرف رکھی اور اندر پڑے باکس کو نکالا۔

اس کے اندر ایک سفید مخملیں کپڑا تھا۔ وہ ہٹایا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اندر کوئی جیولری پیس تھا۔ شاید بریسلیٹ۔ اس نے اس نازک سے ہیروں سے لدے ہوئے جیولری پیس کو ہاتھوں میں اٹھایا۔

وہ بہت خوبصورت تھا۔ چھوٹی چھوٹی پتیوں کے ارد گرد اس کے ننھے ہیرے چمک رہے تھے۔ اس کے دونوں کناروں پر سلور ہیئر پنز لگی ہوئی تھیں۔ وہ شاید ہیئر بینڈ تھا۔ کراؤن کی طرح۔ جیسے شہزادیاں پہنتی ہیں۔

نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش کی۔ پھر آئینے تک آئی۔ اپنے سر پر اسے بینڈ کی طرح لگایا۔ اور جب اس نے تھوڑا پیچھے ہو کر اپنا عکس دیکھا تو اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس نے بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔

وہ بلکل شہزادی لگ رہی تھی۔ اس کے سر پر وہ تاج کی طرح دکھتا بینڈ چمک رہا تھا۔

اس وقت اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو زیادہ حیران ہو جاتا کیونکہ اس کا چہرہ اس سے زیادہ بلش کر رہا تھا۔

اسے آحل سے کبھی ایسی امید نہیں تھی۔ اس نے بنا کہے اسے معتبر کر دیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت تحفہ تھا۔ یا شاید، اس کا احساس سب سے خوبصورت تھا۔

اگلی صبح جب آحل عید کی نماز پڑھنے گیا تو وہ کچن میں ہلکی آنچ پر کھیر رکھ کر جلدی سے تیار ہونے چلی گئی۔ پاؤں کو چھوتی سفید سلک کی فراک کے ساتھ اس نے اونچی ایڑھی والی ہیل پاؤں میں ڈالی۔ بالوں کا پیارا سا ہیئر سٹائل بنا کر پیچھے والوں کو کرل کر کے کھلا چھوڑ

دیا۔ پھر اپنے سائڈ ٹیبل پر رکھے مخملی کپڑے سے وہ ہیئر بینڈ اٹھایا۔ اور مسکرا کر اسے اپنے بالوں پر سیٹ کیا۔ ہلکے سے میک اپ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

پھر کچن آ کر اس نے کھیر کو دو بڑے باؤلز میں نکالا اور ان پر ڈرائی فروٹس کی ٹاپنگ کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ مسکرا بھی رہی تھی۔ آج اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اتنے میں آبشار کی ویڈیو کال آ گئی، اس نے پک کر کے فون سامنے رکھا۔

"عید مبارک ہائمہ۔ کیسی ہو؟ اوہ مائی گاڈ، تم کتنی پیاری لگ رہی ہو!" وہ اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی۔

"عید مبارک۔" وہ آگے سے مسکرائی۔ "کیسی ہو، باقی سب کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں۔ اور تمہیں مس کر رہے ہیں۔"

"میں بھی بہت مس کر رہی ہوں تم لوگوں کو۔" ساتھ ساتھ وہ کچن کا سامان سمیٹ رہی تھی۔

"اف ہائمہ دیہاں سے۔ تیار ہو کر تم کچن میں کھڑی ہو۔ وہ بھی وائٹ ڈریس میں۔ خراب ہو جائے گا۔"

"نہیں ہوتا۔" وہ ہنسی۔

"ویسے یہ کونسا جادو ہو گیا ہے تم پر۔ اتنی صبح تیار ہو گئی؟ پہلے تو عید میں اس وقت ہماری طرح برے حالات ہوتے تھے تمہارے بھی۔"

"اب میں شادی شدہ ہوں۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"اہاں۔ یہ ہوئی نا بات۔ میاں صاحب کے آنے سے پہلے تیار ہو گئی۔ اب تو وہ تمہیں دیکھتے ہی عیدی دیں گے دیکھنا۔"

"عیدی تو وہ دے چکے ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "یہ دیکھو۔ آحل نے گفٹ کیا ہے۔" اس نے اپنے ہیئر بینڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"واؤ۔ یہ کتنا پیارا ہے۔ اس کے ڈائمنڈز دیکھو۔ سو پریٹی۔ آحل بھائی کی چوائس بہت اچھی ہے۔" وہ آگے سے مسکرائی۔

"ہائمہ۔" وہ آگے ہو کر رازداری سے بولی۔ "تم نے کہیں بلش میں اپنا منہ تو نہیں ڈبو لیا؟ اتنا بلش کرتے ہوئے تو کبھی نہیں دیکھا میں نے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"استغفر اللہ۔" اس نے ہنس کر اپنا دوسری طرف کیا۔ "میں بلش نہیں کر رہی۔ یہ تو بس ایسے ہی۔ تم اپنی سناؤ نا۔ تیار ہو کر وسام کو پکس نہیں بھیجنی؟" اس نے بات بدلی۔

"کیوں نہیں۔ ابھی بس تھوڑی دیر میں تیار ہوتی ہوں۔"

"شادی کا کیا بنا؟ تم کہہ رہی تھی کہ عید کے بعد کی ڈیٹ رکھیں گے پھپھو لوگ؟"

"ہاں بس تمہارے آنے کا انتظار ہے۔ تم آؤ تو اگلے دن ہی ڈیٹ فکس کر دیں گے۔"

"ارے۔ میری وجہ سے شادی کو کیوں ٹال رہے ہیں؟ میرا تو کوئی پتا نہیں کب آؤں۔ میرے بغیر بھی تو شادی ہو سکتی ہے آبی۔" اسے افسوس ہونے لگا۔

"بلکل نہیں۔ تمہارے بغیر میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ بس تم جلدی سے آجاؤ۔"

"لیکن آبی..." لونگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔ دل بری طرح دھڑکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کیا کہے گا۔ "میں تمہیں تھوڑی دیر تک کال کرتی ہوں۔" اس نے جلدی سے فون بند کر کے رکھا۔

"ایک گلاس پانی..." وہ بولتا ہوا کچن تک آیا اور اسے دیکھ کر چپ ہو گیا۔ شاید آگے کی بات بھول گیا تھا۔ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اور پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

اور پھر، ایک دم سے اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ جیسے اس نے خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔ وہ مڑ کر جانے لگا کہ اس کی آواز پر رک گیا۔

"عید مبارک۔" اس نے مڑ کر دیکھا، ہائمہ ہاتھ میں گلاس لیے اس کے قریب کھڑی تھی۔ ہیل کی وجہ سے وہ اس سے بس کچھ انچ چھوٹی ہی لگ رہی تھی۔

"خیر مبارک۔" اس نے سر ہلا کر جواب دیا تو اس نے گلاس والا ہاتھ آگے کیا۔

"پانی..."

اس کے ہاتھ سے پانی لے کر وہ کھڑا رہا۔ اس نے اس کی نظروں کا زاویہ دیکھا، وہ اس کے سر پر لگے چمکتے بینڈ کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ لمحے ایسے ہی بیت گئے۔

"اس کے لیے شکریہ۔" اس نے خاموشی کو توڑا تو اس نے فوراً نظریں موڑیں۔

"تمہیں اچھا لگا؟"

"بہت۔"

اس نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر باہر جانے لگا۔

"آحل۔" اس نے پیچھے سے آواز دی۔ "میں ٹاپنگ کر لوں، پھر یہ کھیر کمالہ آنٹی کو دے آیئے گا۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

عید کے دوسرے دن نور فیاہ اور احمد نے ان دونوں کے ساتھ باہر جانے کا پلین بنایا تھا۔ کورونا کی وجہ سے پکنک سپاٹس کو بند کر دیا گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے ایسی جگہ کو منتخب کیا جہاں لوگ نہیں تھے۔ 'انچول بیچ' کی یہ پچھلی طرف نہایت خوبصورت اور پر سکون تھی جہاں عموماً کوئی نہیں جاتا تھا۔

وہ چاروں اس وقت احمد کی گاڑی میں بیٹھے، انچول کے ساحل تک جا رہے تھے۔ آحل فرنٹ سیٹ پر بیٹھا احمد سے محو گفتگو تھا۔ اور نور فیاہ ہائمہ کو اپنی دعوتوں کی تصاویر دکھا رہی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزر کر وہ لوگ اس ساحل تک پہنچے تھے۔ گاڑی

سے اتر کر انہوں نے کھانے کا سامان نکالا جو وہ لوگ گھر سے ہی اپنے ساتھ لائے تھے۔

"بھابی آپ اور نور فیاہ آسانی سے یہاں کھالیں، میں اور آحل گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔" گاڑی کے ساتھ بچھی اس تپائی پر احمد نے سامان رکھا اور آحل کو لے کر واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"ویسے ہائمہ یہ ماسک والا آئیڈیا اچھا ہے نا۔ اب تم کھانا آسانی سے کھا سکتی ہو، نقاب میں تو مشکل ہوتا ہے۔" نور فیاہ اپنی پلیٹ میں ناسی جنگو نکالتے ہوئے مسکرائی۔

"میرے لیے نقاب زیادہ بہتر رہتا ہے، ماسک میں میرا سانس بند ہوتا ہے مگر، اسے پہننا مجبوری ہے۔" اس نے اپنا ماسک اتار کر رکھا۔ نرم ٹھنڈی ہوائیں اس کے چہرے کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ آج جکارتا کا موسم کافی خوشگوار تھا۔

"مجبوری ہی سہی، لیکن ماسک کی وجہ سے باقی سب کا بھی پردہ شروع ہو گیا ہے۔ جو لوگ نقاب والی لڑکیوں پر ہنستے تھے، آج سب منہ چھپائے پھرتے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"خیر یہ پردہ تو نہیں ہے۔ صرف چہرہ چھپانے سے کیا ہوتا ہے۔ باقی سارا جسم نظر آتا ہے جسے چہرے سے پہلے چھپانا چاہیئے۔ اور پردہ نیت سے ہوتا ہے، آج کل تو لوگ مرنے کے ڈر سے منہ چھپائے پھر رہے ہیں۔"

"ہوں۔ یہ مشروم اسٹیکس ٹرائی کرو ہائمہ، بہت مزے کے بنے ہیں۔" اس نے باؤل ہائمہ کی طرف بڑھایا تو اس نے دو تین پیس اپنی پلیٹ میں ڈالے۔

"ہوں... اچھے ہیں۔" وہ منہ میں سٹیکس ڈالتے ہوئے بولی۔ "تم نے بنائے ہیں؟"

"امے نے، وہ کہہ رہی تھیں کہ آحل کو پسند ہیں۔" وہ آگے سے مسکرائی۔

"ہائمہ، آحل کی اس ڈائری کا کیا بنا؟ تم پوری پڑھ لی؟" کھانے کے بعد وہ دونوں پانی کی طرف آئیں۔

"تقریباً۔"وہ مسکرا کر سمندر کو دیکھنے لگی۔

"اور اگر آحل کو پتا چل گیا تو؟"وہ آگے سے ہنس دی۔

"اسے پتا ہے۔اور اس نے کونسا برا منانا تھا، میں بیوی ہوں اس کی۔"اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔اگر آحل اس کی بات سن لیتا تو اور کچھ نہ سہی، اس کے جھوٹ پر ایک زبردست قہقہہ ضرور لگاتا۔

"آف کورس۔"نور فیاہ بھی آگے سے مسکرا دی۔

آحل اور احمد بھی اب باہر آکر انجوائے کر رہے تھے۔انہوں نے ڈھیر ساری تصاویر کھینچیں۔نور فیاہ احمد کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے گئی۔یہ کہہ کر کہ،

"چلو احمد، ہائمہ اور آحل کو تھوڑا ٹائم سپینڈ کرنے دو۔"

"یہ نہیں سدھرے گی، سپیس خود کو چاہیئے اور نام ہمارا لے رہی ہے۔"پیچھے سے آحل سر جھٹک کر ہنسنے لگا۔وہ محض مسکرا دی تھی۔

"آحل۔ہم واپس کب جائیں گے؟"اس نے آگے سے ایک گہرا سانس لیا۔

"پتا نہیں اللہ کی کیا مرضی ہے۔ایسے پھنس گئے ہیں کہ واپسی کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔وہاں میری جاب کی وجہ سے اتنا مسئلہ بن رہا ہے۔"ان دونوں کے قدم خود بخود سمندر کی طرف اٹھنے لگے تھے۔

"کیا پتا کوئی فلائٹس کھل جائیں۔آپ وکال انکل سے بات کریں نا۔"اس نے آگے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ابھی تو گھر کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوا۔پامن لینے پر راضی ہو گئے تھے مگر اب اس کے کاغذات میں کچھ مسائل آرہے ہیں۔"

"یہ گھر آپ کے بابا کی آخری نشانی ہے۔آپ ایسے ہی کسی کے حوالے کر دیں گے؟اور پھر بابا کی قبر یہاں ہے، انہیں آپ اکیلا چھوڑ دیں گے؟"وہ اس کی بات پر خاموش ہو گیا تھا۔

"میں نہیں بیچنا چاہتا۔ میرا سارا بچپن اس گھر میں گزرا ہے۔ اچھی بری یادیں اس سے جڑی ہیں۔ مگر یودا اور اس کے باپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔" وہ اداس لگ رہا تھا۔

"آپ کو ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے حق کے لیے لڑیں۔ انہیں بتائیں کہ وہ گھر صرف آپ کا ہے، کوئی دوسرا شخص اسے چھیننے یا قبضہ کرنے کی کوشش کرے تو وہ غیر قانونی ہو گا اور آپ اس کے خلاف کارروائی کریں گے۔" اس نے مڑ کر ہائمہ کو دیکھا تو اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

"یہ گھر آپ کو اپنے بابا سے جوڑے ہوئے ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ آپ اپنے بابا کو بھول جائیں گے۔ کوئی بھی اپنے ماں باپ کو نہیں بھول سکتا۔ یہ ناممکن ہوتا ہے۔ مگر... زندگی میں کبھی کبھی انسان اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ ماں باپ سے ملنے کا وقت نہیں ملتا۔ اس گھر کے بہانے آپ ان سے ملنے تو آئیں گے۔"

اسے واقعی اس گھر کو نہیں بیچنا چاہیئے تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"جکارتا کا سمندر بہت خوبصورت ہے۔" اپنے گاؤن کو ہاتھوں سے اوپر کیے وہ اس کے ساتھ اس ٹھنڈے شفاف پانی میں چل رہی تھی جس کے نیچے سمندری پتھر صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"انڈونیشیا کے باقی ساحل اس سے زیادہ حسین ہیں۔ وہاں سمندر کا پانی بلکل نیلا ہوتا ہے۔ اور ویو بہت خوبصورت۔ مگر لاک ڈاؤن کی وجہ سے وہ ساری سائٹس بند ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، پھر کبھی دیکھ لیں گے۔ ویسے بھی اب تو آپ گھر نہیں بیچ رہے۔" وہ اس کی بے نیازی پر سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

"چلو میں تمہاری پکچرز لیتا ہوں۔" وہ ہاتھ میں نور فیاہ کا کیمرہ لیے بولا۔

"یہاں پانی میں؟" اس نے آگے سے اثبات میں سر ہلایا۔ "اوکے۔" اس نے اپنا سٹالر درست کیا اور مسکرائی۔ اس نے کیمرہ آنکھوں کے قریب کیا۔ دو تین کلکس لیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس ساحل پر آ گئے۔ دوپہر دم توڑنے کو تھی۔ وہ تھک گئی تھی سو وہیں بیٹھ کر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگی۔

اور اس کے پیچھے کھڑے آحل نے اسے اور اس منظر کو کیمرے کی آنکھ میں قید کر لیا۔ پھر اس کے پاس آ کر کیمرہ اس کے سامنے کیا۔ وہ اپنی تصویر دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔

"واؤ۔ آپ تو پروفیشنل فوٹو گرافی کرتے ہیں۔" وہ بے ساختہ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ جس میں اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سورج کو دیکھ رہی تھی جس کا عکس پانی میں نظر آ رہا تھا۔

سورج کی شعاؤں میں اس کا وجود کسی خوبصورت سائے کی طرح لگ رہا تھا۔

•✶•✶•✶•✶•✶•

(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)